قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1979

اس پرچہ میں:

یہ تھا نظامِ مصطفیٰ!

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ...... ۳۶/ روپے غیر ممالک ...... ۳/ پونڈ
شمارہ ۳	مارچ ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱۔ لمعات .... (حالیہ شرعی قوانین کا جائزہ) ۲

(۱) منشیات ، (۲) سرقہ (چوری) ، (۳) زنا ، (۴) قذف ،

(۵) لعان ، (۶) کوڑے کا تعین۔

۲۔ شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ایک تنبیہ ۱۷

(شیخ محمد محمود حافظ۔ رئیس التحریر ماہنامہ رابطہ العالم الاسلامی۔ مکہ مکرمہ)

۳۔ احتساب (قسط ۵) ۱۹

۴۔ نظامِ ربوبیت ۲۳

۵۔ یہ تھا نظامِ مصطفےٰ! ۲۵

عید میلاد النبیؐ (۱۹۷۹ء) کی تقریب پر، پرویز صاحب کا خطاب)

۶۔ سیرۃ الرسول .... (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب) ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حالیہ شرعی قوانین کا جائزہ

جن شرعی قوانین کا چرچا ایک عرصہ سے ہو رہا تھا، محترم صدر مملکتِ پاکستان نے ان کا، ۱۲ ربیع الاوّل کے مقدّس یوم (بابت ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء) کو اعلان بھی کر دیا اور ان کے متعلق احکامات بھی جاری کر دیئے، جو پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۲ فروری میں شائع ہوئے ہیں۔ ان قوانین کا تعلق ان سزاؤں سے ہے، جنہیں فقہی اصطلاح میں حدّ (جمع حدود) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (۱) شراب (منشیات)۔ (۲) سرقہ (چوری اور ڈاکہ)۔ (۳) زنا۔ (۴) قذف (تہمت تماشی) اور لعان (میاں بیوی کی ایک دوسرے کے خلاف تہمت تراشی) سے متعلق ہیں۔ نیز ان میں "کوڑے" کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام کا اجراء ۱۹۳۸ء میں (قبل از تقسیم ہند ہوا)۔ اس کے بعد یہ پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ جن قارئین کی نظروں سے یہ شروع سے گزر رہا ہے وہ اس حقیقت سے واقف اور اس کے شاہد ہیں کہ:۔

۱۔ اس کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ نہ ہی اس نے کوئی اپنا نیا فرقہ بنایا ہے۔

۲۔ اس نے نہ کبھی کوئی ایسی بات کی ہے جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو، اور نہ ہی اس نے کبھی عملی سیاسیات میں حصّہ لیا ہے۔

۳۔ اس تیس سال کے عرصہ میں، نہ اس کا تعلق کسی حکومت سے رہا ہے، اور نہ ہی اس نے ملک میں پیدا ہونے والے کسی قسم کے ہنگامے اور انتشار کی تائید و حمایت کی ہے۔ اس نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔

۴۔ اس نے کبھی نہ خود قانون شکنی کی ہے، نہ کسی کو قانون شکنی کی ترغیب دی ہے۔ قانون شکنی کی یہ مخالفت کرتا ہے، اور کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کے لئے آئینی اور قانونی طریقِ کار اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ یہ کہ جو کچھ کوئی کہے، یا کرے، یا ملک میں جو کچھ ہو، قرآنِ کریم کی روشنی میں اس کا جائزہ لے کر بتائے کہ کتاب اللہ کی رو سے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے ملک کے ہر

آئین کو بھی اسی معیار کیمطابق پرکھا، اور ہر قانون کا اسی کی روشنی میں جائزہ لیا، اور اس کے بعد وہ، اپنی قرآنی بصیرت کی رو سے جس نتیجہ پر پہنچا، اسے بے کم وکاست اور بلا رو رعایت قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ خواہ وہ کسی کے خلاف جائے یا کسی کے حق میں۔ اس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری از خود عائد نہیں کر رکھی۔ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پر لازم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ۔ (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان واضح احکام اور راہ نمائی کی باتوں کو چھپا کر رکھیں جنہیں ہم نے نازل کیا ہے، اس کے بعد کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کے لئے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی لعنت بھی۔

آپ غور فرمائیے کہ احکام و ارشاداتِ خداوندی کو چھپانے کے خلاف کس قدر سخت وعید ہے۔ دوسرے مقام پر اس کا حکم دیا گیا کہ:۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (۲/۴۲)

جب تم جانتے ہو کہ حق کیا ہے تو پھر نہ تو حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

یہ (اور اسی قسم کے متعدد دیگر ارشاداتِ خداوندی) کی رو سے، ہم پر یہ اہم فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم ہر پیش آنے والے معاملہ کے متعلق بتائیں کہ قرآنِ مجید کا اس باب میں فیصلہ کیا ہے۔ یوں تو اس قسم کی وضاحت ہر معاملہ میں ضروری ہے، لیکن موجودہ قوانین کے سلسلہ میں اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کیا گیا ہے۔ "اسلامی" کی اصطلاح بڑی وسیع اور غیر متعین ہے۔ اس میں بہت کچھ شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ کے "اسلامی احکام" (جو ان کی فقہ کے احکام ہوتے ہیں) دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر احکام بھی فقہی احکام ہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآنِ مجید کی رُو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہی کو حق و باطل کا معیار، بلکہ کفر و ایمان کا خطِ امتیاز قرار دیا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ:۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

اور خود رسول اللہ کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ۔ (۵/۴۸) "تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ لہٰذا، کوئی حکم۔ کوئی قانون۔ کوئی فیصلہ، جو کتاب اللہ کے خلاف ہو، وہ یقیناً سنتِ رسول اللہ کے بھی خلاف ہوگا۔

زیرِ نظر قوانین کے متعلق اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ:۔

۱۔ ان کا تعلق حدود سے ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں حد (جمع حدود) ان سزاؤں کو کہتے ہیں جو متعین اور مقرر

ہیں۔ اور جو سزائیں مقرر نہیں انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ اپنے جائزہ میں ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ ان میں جو سزائیں بطور حدود تجویز کی گئی ہیں، قرآنِ کریم کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ یعنی وہ قرآن کے مطابق ہیں یا نہیں۔

۲۔ ان قوانین کے متن وغیرہ کے متعلق طلوعِ اسلام کو اتھارٹی نہ تصوّر کر لیا جائے۔ اتھارٹی وہی ضابطہ ہوگا جسے حکومت شائع کرے گی۔ غالباً اس نے اسے شائع کر دیا ہے۔ ہم نے بہرحال انہیں پاکستان ٹائمز بابت ۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء سے اخذ کیا ہے۔

ان تمہیدات کے بعد آیئے، ان قوانین کی طرف، وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(۰)

(۱)۔ منشیات

ان میں شراب، بھنگ، چرس، افیون وغیرہ تمام نشہ آور چیزیں شامل ہیں اور ان کا بنانا، رکھنا، لے جانا، خرید و فروخت کرنا، استعمال کرنا ممنوع اور مستوجبِ سزا جرم ہے۔ ان کے استعمال کی حد (سزا) اسّی (۸۰) کوڑے قرار دی گئی ہے۔ دیگر جرائم کی تعزیری سزائیں مختلف ہیں۔

قرآنِ کریم میں خمر کی ممانعت کی گئی ہے۔ خمر کے لغوی معنے ڈھانپ دینے کے ہیں اور چونکہ نشہ انسانی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے اس لئے عربوں کے ہاں شراب کو خمر کہا جاتا تھا۔ چونکہ قرآنِ کریم میں آیا ہے: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴/۴۳) "جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ"۔ اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ہر نشہ آور چیز ممنوع ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی ممانعت تو آئی ہے لیکن اس نے اس کی کوئی سزا خود مقرر نہیں کی۔ اس کی ممانعت میں بھی بڑی اہم حکمتِ عملی سے کام لیا گیا تھا۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے رفتہ رفتہ انسان ان کا ایسا عادی ہو جاتا ہے کہ انہیں یک لخت چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں اس کی ممانعت کے احکام بتدریج نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انہیں سمجھایا گیا کہ: فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹)۔ "ان میں تھوڑے بہت فائدے بھی ہیں لیکن ان کے نقصان ان کے فائدے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں"۔ پھر کہا گیا کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) "اے جماعتِ مؤمنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ تاآنکہ جو کچھ تم کہتے ہو اُسے سمجھ سکو"۔ اور پھر آخر میں خمر کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ۔ "شیطانی عمل" قرار دے کر حکم دیا کہ: فَاجْتَنِبُوْهُ۔ "اس سے اجتناب کرو"۔ اور آخر میں کہا کہ: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵/۹۱) "اور کیا تم اس پر بھی باز نہیں آؤ گے"۔ ان تدریجی احکام کا نتیجہ تھا کہ خمر کی آخری ممانعت مدینہ میں جا کر ہوئی۔ یعنی آغازِ نبوّت سے کم از کم چودہ پندرہ سال بعد۔ اس دوران میں اس کے متوالوں کو آہستہ آہستہ اس حقیقت کی طرف لایا گیا کہ انہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔

حالیہ قانون میں اس تدریج کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا اور فوری ممانعت کے احکام نافذ کر دیئے گئے ہیں دیگر نشوں

کے متعلق تو ہمیں معلوم نہیں۔ افیونیوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ اگر انہیں وقت پر افیون نہیں ملتی تو ان کی کرب انگیز حالت دیکھی نہیں جاسکتی۔ وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات انہیں جان تک کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر قانون کے فی الفور نفاذ سے بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جائیں گی اور بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اس قسم کی پیچیدگیوں اور مشکلات سے بچنے کے لئے کتاب (قانون) کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ صدرِ اوّل میں اس جرم کی سزا کے سلسلہ میں بھی شروع میں اتنا ہی تھا کہ مجرم کو کسی درخت کی ٹہنی سے، چادر سے، یا ہاتھوں سے پیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے شروع میں بھی یہی عمل جاری رہا۔ عہدِ فاروقی کے اخیر زمانے میں چالیس تازیانوں کی سزا مقرر کی گئی اور عادی مجرم کیلئے اسّی (۸۰) تازیانے۔

ان سطور کی تسوید کے وقت یہ خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ اس قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں نرمی برتنے کی تجاویز اور تدابیر زیرِ غور ہیں۔

(۲) ۔ سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ پہلی دفعہ کے جرم کی سزا کے طور پر مجرم کا دایاں ہاتھ، اس کی کلائی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے گا۔ دوسری بار کے جرم پر مجرم کا بایاں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد کے ارتکابِ جرم کی سزا عمر قید ہوگی جسے، مجرم کے تائب ہونے کی صورت میں ہائی کورٹ معاف بھی کر سکے گا۔

قرآنِ مجید میں سرقہ کے جرم کے سلسلے میں کہا گیا ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (۵/۳۸)

سرقہ کے مجرم مرد یا سرقہ کی مجرمہ عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے۔ جو اللہ کی طرف سے اس جرم کی روک تھام کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ وہ اللہ جو غلبہ بھی رکھتا ہے اور حکمت بھی۔

اللہ تعالےٰ کے صاحبِ غلبہ (ذی اقتدار) ہونے کا ثبوت تو ارتکابِ جرم کی مقرر کردہ سزا ہے۔ لیکن اس کے صاحبِ حکمت ہونے کی شہادت اس سے اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ فرمایا:۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۵/۳۹)

پھر جو شخص ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر شرمسار ہو اور اپنی اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً اللہ ایسے لوگوں کو سزا سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور انہیں اپنی مرحمت سے نوازتا بھی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ سزا پہلی بار کے جرم کے ارتکاب پر نہیں دی جا سکتی۔ ارتکابِ جرم پہ نادم ہونے والے مجرم کو آئندہ کے لئے اصلاح کی غرض سے معافی بھی دی جا سکتی ہے۔ یا عندالضرورت کوئی تعزیری سزا بھی۔ قطعِ ید کی سزا عادی مجرموں کے لئے ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ایک عام اصول بتایا گیا ہے۔ یعنی:۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۔ (۳/۱۳۵)

جو لوگ کوئی برائی کی بات کر بیٹھیں یا کسی جرم کے ارتکاب سے اپنے آپ پر زیادتی کر لیں، اور اس کے بعد جب، قانونِ خداوندی ان کے سامنے آئے تو وہ اپنے جرم کے لئے معافی کے خواستگار ہوں، تو قانونِ خداوندی میں معافی کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ یہ معافی ان مجرموں کے لئے ہے جو جانتے بوجھتے بار بار ارتکابِ جرم نہ کریں۔ یعنی عادی مجرم نہ ہوں۔

غیر مصر مجرموں کے متعلق کہا کہ:۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ (۳/۱۳۶)

قانونِ خداوندی کی رو سے ایسے مجرمین کو معافی دی جائے۔

اس کی تائید میں روایات بھی موجود ہیں۔ ایک روایت میں تو یہاں تک بھی آیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک مجرم کو چار مرتبہ چوری کرنے پر بھی قطعِ ید کی سزا نہیں دی۔ علاوہ ازیں اس قسم کی سزاؤں کے نفاذ میں معاشرہ کے حالات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں غلّہ کی چوری کو مستوجبِ سزا قرار نہیں دیا تھا۔ اس سلسلے میں حاطبؓ ابنِ بلتعہ کے ملازموں کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ انہوں نے کسی کی اونٹنی چرا کر اور اُسے ذبح کر کے کھا لیا۔ جرم بھی ثابت ہو گیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر، کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا، انہوں نے کہا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن ہمیں کھانے کو کم دیتا ہے۔ اور ہم نے بھوک سے تنگ آ کر ایسا کیا ہے۔ اس پہ آپؓ نے ان مجرموں کو تو چھوڑ دیا اور مالک کو بلا کر کہا کہ مجرم یہ نہیں، تم ہو، کہ جس نے انہیں اس جرم کے ارتکاب پہ مجبور کر دیا۔ اس دفعہ تو تم سے رعایت برتی جاتی ہے۔ تم اونٹنی کے مالک کو اس کی قیمت ادا کر دو۔ اگر آئندہ ایسا کیا تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ غیر اسلامی معاشرہ میں اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے متعلق تائیدین کی توجہ مودودی صاحب کے اس مقالہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔[1] خود قرآن کریم نے معاشرتی حالات کا اس قدر لحاظ رکھا ہے کہ اس نے لونڈیوں کے لئے (جو اس زمانہ کے عربی معاشرہ میں موجود تھیں) جرمِ زنا کی سزا آزاد عورتوں کے مقابلے میں نصف مقرر کی۔

---

(۱) مودودی صاحب نے اپنی تنبیہات کے باوجود حالیہ قوانین کے نفاذ کو مستحقِ تبریک و تحسین قرار دیا ہے۔
(ہفت روزہ ایشیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء۔ ص ۹)

(۲)۔ زیرِ نظر قانون میں دوسری مرتبہ کے ارتکابِ جرم کے لئے بایاں پاؤں کاٹنے کی سزا رکھی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں سرقہ کے جرم میں صرف ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی گئی ہے، پاؤں کاٹنے کی نہیں۔

(۳) اس قانون میں سرقہ کا نصاب (۴ ــــ اعشاریہ ۔ ۴۵۷) گرام سونا (یا اس کے برابر قیمت) مقرر کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں سرقہ کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔

حرابہ

زیرِ نظر قانون میں حرابہ کو بھی مستوجبِ حد قرار دیا گیا ہے۔ فقہی اصطلاح میں حرابہ کا لفظ عام طور پر ڈکیتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس جرم کی مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں جن میں سے ایک سزا مجرم کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دینا ہے۔

حرابہ کے ضمن میں ذیل کی قرآنی آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۵/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے، یا صلیب دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دیئے جائیں یا قید یا جلاوطنی کر دیا جائے یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب۔ (اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ قبل اس کے کہ ان پر قابو پا لیا جائے توبہ کر لیں تو پھر انہیں معافی دی جا سکتی ہے)۔

اس آیت میں محاربہ کے معنے مملکت کے خلاف بغاوت، اور فساد فی الارض کے معنی (عام طور پر) ہنگامہ آرائیاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات بڑی وسیع ہیں اور فقہ میں ان سے مراد، ڈاکہ زنی بھی لی جاتی ہے۔ اور اس کی سزا ہاتھ اور پاؤں کا کاٹ دینا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام قانون شکنی بھی مملکت کے خلاف بغاوت کے ذیل میں آجاتی ہے اور چونکہ اس آیت میں سزائے موت، صلیب، ہاتھ پاؤں کا کاٹنا اور قید یا جلاوطنی متبادل سزاؤں کے طور پر تجویز کی گئی ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ حرابہ کے علاوہ دیگر جرائم کی کم از کم سزا قید بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ زیرِ نظر قانون میں حرابہ کو ڈکیتی کے معنوں میں لیا گیا ہے اور اس کی سزا آیت (۵/۳۳) کی رو سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔

(ضمناً) بعض لوگ قطعِ ید سے مراد ہاتھ کا سچ مچ کاٹ دینا نہیں لیتے۔ عربی زبان کی رُو سے اس کے معنی روک تھام کے بھی ہوتے ہیں اس لئے وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے مجرم آئندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے خود بخود رُک جائے۔ توبہ اور اصلاح اس کی بنیادی تدبیر ہے۔

(۳)۔ زنا

جرمِ زنا کی سزا کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ .... (۲۴/۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

الزانی اور الزانیۃ میں ہر قسم کے مجرم آجاتے ہیں لیکن زیرِ نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر:۔

(۱) زانی مرد یا زانیہ عورت شادی شدہ (محصن) ہو تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے۔ اور

(۲) اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں تو انہیں سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

قرآنِ مجید میں رجم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے لئے جو سند لائی جاتی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ روایات میں ہے کہ جب رسول اللہؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضرت زیدؓ بن ثابت کی زیرِ سرکردگی قرآنِ کریم کے جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا گیا تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ اُن کے جمع کردہ قرآن میں آیۂ رجم نہیں۔ وہ اس آیت کو لے کر حضرت زیدؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اصول یہ طے کر رکھا ہے کہ جو شخص کسی آیت کو لے کر آئے اُسے اس وقت درجِ قرآن کیا جائے جب وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک گواہ بھی لائے۔ حضرت عمرؓ کوئی گواہ نہ لا سکے اس لئے یہ آیت قرآن میں درج نہیں کی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ ہم رسول اللہؐ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

قرآن کی دو آیتیں کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی میرے صحیفہ میں موجود تھیں۔ ایک آیۂ رجم اور دوسری رضاعت (جس میں کہا گیا تھا کہ دودھ کے دس گھونٹ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے) جب رسول اللہؐ نے وفات پائی تو ہم اس حادثہ میں مشغول ہو گئے۔ میری بکری آئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اس لئے اب یہ آیتیں تمہیں کہاں سے مل سکیں گی؟) (ابن ماجہ)

اس طرح یہ دو آیتیں قرآن میں درج نہ ہو سکیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ قرآن میں درج نہیں ہو سکیں، تو کوئی بات نہیں ہم ان پر عمل اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ جب آپ کو اس قدر یقین ہے کہ آیۂ رجم قرآن کی آیت ہے تو آپ اسے داخلِ قرآن کیوں نہیں کر دیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو ضرور داخلِ قرآن کر دیتا۔

چنانچہ یہ آیت قرآن میں تو داخل نہ ہوئی لیکن عمل اس کے مطابق ہوتا رہا۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جو قرآنِ کریم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ اور بعض آیات ایسی جو

قرآن میں موجود نہیں لیکن حکم ان کا جاری ہے۔ آیۂ رجم کا شمار انہی آیات میں کیا جاتا ہے۔ یہ ہے جرمِ زنا کے لئے رجم کی سند۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآنِ مجید میں رجم کی سزا کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لونڈیوں کے جرمِ زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہوگی (۴/۲۵)۔ کوڑوں کی سزا کا نصف تو ہو سکتا ہے، رجم کی سزا کا نصف نہیں ہو سکتا۔

جرم کا ثبوت

جرمِ زنا کے ارتکاب کے ثبوت کے لئے زیرِ نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اس کے لئے:۔

(۱) چار ثقہ اور پاکباز گواہ ہونے چاہئیں۔ اور

(۲) ان گواہوں نے اس فعلِ شنیع کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول (ACT OF PENETRATION) کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

قرآنِ کریم نے فعلِ زنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے لئے عام طور پر مندرجہ ذیل آیت سے سند لائی جاتی ہے:۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَہِدُوْا فَاَمْسِکُوْہُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیْلًا۔ (۴/۱۵)

تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی کسی امرِ فاحش (بے حیائی) کا ارتکاب کرے تو اس کے ثبوت میں تم میں سے چار مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر وہ گواہی دیں تو ایسی عورتوں کو پابندِ مسکن کیا جائے۔ تاآنکہ وہ وفات پا جائیں یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے۔

اس آیت میں لفظ الفاحشۃ آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زنا بھی فواحش میں شامل ہے۔ لیکن ہر فحش کام زنا نہیں ہو سکتا۔ اس سے مراد عام بے حیائی کی باتیں ہیں جن کی اگر شروع میں روک تھام نہ کی جائے تو وہ آخر الامر زنا تک لے جا سکتی ہیں۔ انہیں انگریزی زبان میں (OBSCENITY) کہا جائے گا۔ اس مفہوم کی تائید خود اس آیت سے ہوتی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس میں صرف عورتوں کا ذکر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ زنا کا ارتکاب تنہا

۱؎ واضح رہے کہ قرآنِ مجید نبی اکرمؐ کی زندگی میں جمع، مرتب اور مدوّن ہو چکا تھا اور حضورؐ نے اسے اُمت کو اسی شکل میں دیا تھا جس شکل میں یہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں نہ کوئی آیت درج ہونے سے رہ گئی ہے اور نہ ہی کوئی آیت منسوخ ہے۔ ان امور کی تفصیل، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" اور پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی۔

عورت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے عورت کے ساتھ مرد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے سورۃ النور میں الزانیۃ اور الزانی (۲۴/۲) دونوں آئے ہیں۔ زیر نظر آیت میں ایسی بے حیائی کی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی مرتکب تنہا عورت ہو سکتی ہے۔

اور دوسرے اس لئے کہ اس آیت میں اس جرم کی سزا پابند مسکن بتائی گئی ہے حالانکہ زنا کی سزا سو کوڑے ہے۔ لہٰذا، اس آیت سے فعل زنا کے لئے چار گواہوں کی دلیل نہیں لائی جا سکتی۔

سورۂ النور کی آیت ۴ میں چار گواہوں کی شرط کا ذکر ہے لیکن وہ تہمت تراشی (قذف) کے سلسلے میں ہے اور قذف کے لئے ایک الگ قانون ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۴)۔

جو لوگ پاکباز عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ لا سکیں تو ان تہمت تراشوں کو اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔ کیونکہ وہ فاسق ہیں۔

(اگلی آیت میں ان کے تائب ہونے کی صورت میں معافی کا ذکر آیا ہے)۔

تہمت تراشی کے سلسلے میں چار گواہوں کا ذکر سورۂ النور کی آیت ۲۴/۱۳ میں بھی آیا ہے۔ وہاں اس کے لئے افک کا لفظ آیا ہے۔ ان آیات میں جرم تو تہمت تراشی کا ہے لیکن ان سے زنا کے سلسلے میں یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان شہادات کی رو سے تہمت صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے گویا جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ یوں جرم زنا کے ثبوت کے لئے بالواسطہ چار گواہوں کی شہادت کی تائید مل سکتی ہے۔

عینی شہادت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے زیرِ نظر قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اس فعل کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ قرآنِ کریم میں اس قسم کی شرط کا تو تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شرط کی رُو سے زنا کا جرم ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا، اس کی سزا بھی نہیں مل سکتی۔ فقہ کی رُو سے اس شہادت کی شرائط کس قسم کی ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ) اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کر دی لیکن کہا یہ کہ اس نے ملزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا، تو اس سے اس ملزم پر حد جاری نہیں ہوگی۔ لیکن پہلے تین گواہوں کو جرم قذف کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور انہیں اسّی اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ اردو ترجمہ۔ صفحہ ۳۴۲)۔

نوٹ:۔

زیرِ نظر قوانین میں خلافِ وضعِ فطرت جنسی اختلاط کا (HOMO SEXUALITY) کا ذکر نہیں۔

(۴)۔ قذف

قذف سے مراد ہوتی ہے کسی پاکباز عورت کے خلاف زنا کی تہمت لگانا۔ اس باب میں قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۴)۔

جو لوگ پاکباز عورتوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس عائد کردہ الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسّی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو کیونکہ یہ لوگ فاسق ہیں۔

(اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ اس کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انہیں معاف کیا جا سکتا ہے)۔

قرآنِ کریم نے عورتوں کے خلاف بہتان تراشی کا ذکر کیا ہے لیکن زیرِ نظر قانون میں "کسی شخص کے خلاف تہمت لگانے" کا ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس میں عورتوں کی تخصیص نہیں۔ عورت ہو یا مرد، کسی کے خلاف بھی زنا کی ناحق تہمت لگانا جرم قرار پائے گا۔ اس کی سزا تو اسّی (۸۰) کوڑے ہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کے ثبوت کے لئے صرف دو گواہوں کی شہادت کافی قرار دی گئی ہے۔

قرآنِ کریم میں بہتان تراشی کے علاوہ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے اور بڑا سنگین جرم۔ سورۂ احزاب میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ وہ اپنی ازواجِ مطہرات، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اوپر کے پیرہن کو لٹکائے رکھا کریں تاکہ محض لباس ہی سے معلوم ہو جائے کہ وہ شریف زادیاں ہیں اور انہیں کوئی تنگ نہ کرے۔ اس کے بعد کہ اگر اس کے باوجود شریر الطبع اور جھوٹی خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں تو لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۳۳/۶۰) "جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں گرفتار کیا جائے اور قتل کیا جائے۔" ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق بھی قانون نافذ کرنا ضروری ہے کیونکہ اس قسم کی حرکتیں آج کل عام ہو رہی ہیں۔

(۵)۔ لعان

قرآنِ کریم میں ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس الزام کے ثبوت میں ان کے اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسا شخص چار مرتبہ حلفیہ بیان کرے کہ میں بالکل سچ کہتا ہوں اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر یہ الزام جھوٹ ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں اس کی بیوی بھی اسی طرح قسمیں کھائے اور کہے کہ اس کا خاوند جھوٹ کہتا ہے اور یہ بھی اضافہ کرے کہ اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔ (سورۂ النور آیات ۶-۹)

زیرِ نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ عورت اپنے خاوند کے الزام کی اس طرح تردید نہ کرے تو اسے جرمِ زنا کی سزا دی جائے۔ اور اگر وہ اس کی تردید کر دے تو پھر عدالت مجاز ان کے نکاح کو فسخ کرنے کا حکم صادر کر دے۔

قرآنِ کریم میں تو اس کی صراحت نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ جب میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات کی یہ صورت ہو تو ان کے نکاح کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس فیصلے کی رو سے طلاق کے ضمن میں بہت سے سوالات اُبھریں گے لیکن چونکہ عائلی قوانین کے سلسلے میں ابھی کوئی بات سامنے نہیں آئی اس لئے سرِدست اس نکتہ پر بحث نہیں کی جا سکتی۔

(۶) - کوڑے کا تعیّن

قرآنِ کریم میں کوڑوں کی سزا تو مقرر کی گئی ہے لیکن کوڑے کا تعیّن نہیں کیا گیا کہ وہ کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ ایک بات البتہ واضح ہے اور وہ یہ کہ اس نے سزا کے طور پر سو سو اور اسّی اسّی کوڑے مقرر کئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوڑا ایسا ہونا چاہیئے جس کی سو سو اور اسّی اسّی ضربیں بھی انسانی حدِ برداشت سے باہر نہ ہوں۔ حالیہ قوانین میں کہا گیا ہے کہ کوڑا اس کے دستے کو چھوڑ کر ایک ٹکڑا ہوگا اور بہتر یہ ہو کہ وہ چمڑے کا بنا ہوا ہو یا بید ہو یا کسی درخت کی شاخ جس پر کوئی گانٹھ یا جوڑ نہ ہو۔ اس کی لمبائی ایک اعشاریہ بائیس میٹر اور موٹائی ایک اعشاریہ پچیس سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوڑے لگانے کے لئے بھی جزئیات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس انداز کی تازیانہ زدگی کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ تو ان کے عملی استعمال کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔

(۱)

یہ ہیں حالیہ نافذ کردہ قوانینِ حدود کے نمایاں خدوخال۔ ہم نے ان قوانین پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان جرائم کے متعلق قرآنِ کریم میں کیا آیا ہے۔ یہ درحقیقت فقہی قوانین ہیں اور فقہ کے متعلق ہمارا موقف اور مسلک واضح ہے۔ ہمارے نزدیک فقہی قوانین ابدی یا غیر متبدل نہیں ہوتے۔ ابدی اور غیر متبدل تو خدا کے احکام، قوانین اور اصول ہوتے ہیں۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین نہیں۔

ہم نے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت فروری ۱۹۷۹ء) کے لمعات میں یہ لکھا تھا کہ سزاؤں سے متعلق قوانین نافذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جرائم کی تفتیشی ایجنسی، انتظامیہ اور عدلیہ کو ان ہر عنوانیوں اور رشوت ستانیوں سے پاک کیا جائے جن کی وجہ سے لوگوں کو عدل اور انصاف نہیں مل رہا۔ ہم نے ججوں اور گواہوں کے متعلق قرآنی معیار کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا تھا کہ:-

> اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگیٔ سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکابِ جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔ اس قسم کی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت اس پنج گرانہ سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر جرائم کا سدِباب تو ایک طرف عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محترم صدرِ مملکت نے بھی اس ضرورت کا اظہار فرمایا ہے۔ اگلے دنوں انہوں نے (C.B.S.) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا جو پاکستان ٹائمز کی اشاعت بابت اٹھارہ فروری میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حالیہ

قوانین اور ان کی رُو سے دی جانے والی سزاؤں کے متعلق بھی ایک سوال پوچھا گیا۔ وہ سوال اور صدرِ محترم کی طرف سے اس کا جواب درج ذیل ہے:۔

سوال:۔ مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدلِ انسانی کہلا سکے گا؟

جواب:۔ یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تخویف (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزاؤں (مثلاً ہاتھ کاٹ دینا۔ یا ہاتھ اور پاؤں دونوں کاٹ دینا۔ یا سنگسار کر دینا) کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی یہ سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔ اسلام صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا۔ وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان ججوں یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے، بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کی سیرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جا سکے۔ اسے انتہائی دیانتدار ہونا چاہیئے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہیئے۔ اسے کسی کے خلاف تعصّب نہیں ہونا چاہیئے۔ (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہیئے)۔ یہ تو وہیں اس جج کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثباتِ جرم کے لئے پیش کی جائیں، تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پانا ناممکن ہوگا جس کے ارتکابِ جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً گواہ کو یعنی شاہد ہونا چاہیئے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیثِ نبوی میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطعِ ید وغیرہ سزاؤں کے مستوجب ہوں، تو کوشش کرنی چاہیئے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جا سکے خواہ اس میں تھوڑا سا شک بھی کیوں نہ ہو۔ (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ بھی ملزم کو ملنا چاہیئے)۔

سوال:۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ان سزاؤں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب:۔ یہ ٹھیک ہے۔ بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزاؤں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے لحاظ انداز کرنے سے اہلِ مغرب کو غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانونِ شہادت۔ ججوں کی تعیناتی۔ گواہوں کے متعلق شرائط۔ (یعنی) وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی رُو سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بمشکل ایک

مقدمہ ایسا ہوگا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جا سکیں گی۔

اس سلسلے میں ہم اتنا گذارش کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ حالیہ قوانین کو ان شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد نافذ کیا جانا چاہئے تھا۔ ضمناً ان قوانین میں مجرم کے انفرادی حالات یا جرم اوّل کی صورت میں سزا کی تخفیف کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

(۰)

ان قوانین کو نافذ کرتے وقت صدرِ محترم نے فرمایا تھا کہ انہیں مختلف فرقوں نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے ہمیں دلی خوشی ہوئی تھی کہ یہ چیز وحدتِ قانون اور اس کے بعد وحدتِ اُمت کے حق میں بڑا نیک شگون ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمیں ہزار برس میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کی فرقہ وارانہ مخالفت شروع ہو گئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں شیعہ حضرات کے نمائندہ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب کونسل میں یہ قوانین پیش ہوئے تو انہوں نے ان کی بعض جزئیات سے اختلاف کیا تھا لیکن انہیں اس کے باوجود کثرت رائے سے پاس کر دیا گیا۔ اس کے بعد شیعہ حضرات کی مختلف جماعتوں کی طرف سے اس قسم کے بیانات شائع ہو رہے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فرقہ جعفریہ پر اکثریت کی فقہ یعنی ـــــ فقہ حنفی ـــــ کو مسلط کیا جا رہا ہے جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی طرف سے یہ احتجاج نیا نہیں۔ انہوں نے بہت پہلے ایسا کہہ دیا تھا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نہایت مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ اٹھا، یا اٹھایا گیا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ ہم نے کہا کہ اس کی وضاحت کر دی جائے کہ اسلامی قوانین کی بنیاد کیا ہوگی۔ اکتیس علماء کے ایک اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شخصی قوانین تو ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے لیکن پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ بات بالکل واضح تھی۔ جسے "کتاب و سنّت" کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوتی ہے جسے بدلنے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے لئے کوئی فرقہ تیار نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہوا کہ پبلک لاز کا فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو ان سب کے نزدیک اسلامی کہلا سکے۔ اس سے گریز کی راہ یہ تراشی گئی کہ طلوعِ اسلام کے متعلق مشہور کر دیا گیا کہ یہ منکرِ سنت ہے تاکہ لوگ اس کی بات نہ سُنتے پائیں۔ بیس برس تک یہ پراپیگنڈہ بھی جاری رہا اور ملک میں کوئی ضابطہ قوانین بھی نہ بن سکا۔ بالآخر ۱۹۶۷ء میں، مودودی صاحب کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رُو سے فی الواقعہ پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس پر سوال اٹھا کہ پھر پبلک لاز مدوّن کیسے کئے جائیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ چونکہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج کر دی جائے۔ اس کے خلاف اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔

شیعہ حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ہم پر اکثریت کی فقہ کو مسلط کیا گیا تو "ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"۔ ان خدشات کے پیشِ نظر ہم نے اس موضوع پر طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ایک مبسوط مقالہ لکھا جس کا عنوان

تھا" اسلامی مملکت کا خواب جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہو گیا" اس مقالہ کا پمفلٹ بھی شائع کیا گیا جسے کثیر تعداد میں ملک میں تقسیم کیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ یہ ملک (خدانخواستہ) خانہ جنگی کا شکار نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ ملکوں کی تقدیر کے لئے سیاسی اختلافات اتنے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے جتنے خطرناک مذہبی اختلافات ہوتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں اس حقیقت کا ایک بار پھر اعادہ کر دینا ضروری ہے کہ ہمارا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ اس لئے ہم نہ کسی فرقے کی فقہ کے خلاف ہیں نہ کسی کے حق میں۔ ان فقہوں میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے (وہ کسی فرقہ کی فقہ میں ہو) ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ جو اس کے خلاف ہو اُسے غلط۔ لیکن مودودی صاحب کا اس فقہ حنفی کے متعلق کیا عقیدہ ہے جسے ملک میں نافذ کرنے کی انہوں نے تجویز پیش کی تھی، اسے مختصر الفاظ میں واضح کر دینا ضروری ہے۔ وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

> امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں۔ یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۷۴-۷۵)

اس سوال کے جواب میں کہ کیا فقہی احکام ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں:-

> یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستند ہوتی ہے، اس لئے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں۔ مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۴۲۶)

حنفی مسلک کا مدار آئمہ فقہ کی تقلید پر ہے۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> میرے نزدیک ایک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۳۶)

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جب ۱۹۶۷ء میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ملک میں حنفی فقہ رائج کر دی جائے تو اس کے خلاف اہلِ حدیث اور اہلِ شیعہ حضرات نے شدت سے احتجاج کیا تھا۔ اس کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین یا نفاذ کا سوال سامنے نہ آیا۔ اب پہلی بار ان قوانین کو اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے اور ان کے خلاف سرِدست شیعہ حضرات نے اپنے اُسی احتجاج کا اعادہ کیا ہے جسے انہوں نے

۱۹۷۰ء میں بلند کیا تھا۔ شیعہ مطالبات کمیٹی کے جائنٹ سیکرٹری کی طرف سے شائع کردہ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ:۔

اہلِ تشیع کے نزدیک فقہ جعفریہ ہی نظامِ مصطفیٰؐ ہے۔ اس لئے ہم موجودہ اعلانات کو حقیقی معنوں میں نظامِ مصطفیٰؐ کا نفاذ نہیں سمجھتے اور موجودہ حالات میں اہلِ تشیع بجا طور پر فکرمند ہیں۔ انہوں نے شیعہ مطالبات کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کر لیا ہے جو اپریل کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔

(بحوالہ روزنامہ مساوات۔ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۷۹ء)

اس طرح ان اختلافات کا آغاز ہو رہا ہے۔ ابھی چار پانچ قوانین ہی نافذ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایسے جن کا تعلق حدود (سزاؤں) سے ہے۔ ان میں اختلاف کی زیادہ صورت نہیں ہوتی۔ مزید قوانین نافذ ہونے کے بعد معلوم کس کس قسم کے اختلافات نمودار ہوں؟

فقہی اختلافات کے علاوہ، ان قوانین کے عملی اطلاق کے وقت بہت سے جزئیاتی اختلافات بھی سامنے آئیں گے۔ حکومت کی طرف سے شریعت بنچوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جن کا منصب یہ ہے کہ جس قانون کے متعلق کوئی پاکستانی شہری یہ سمجھے کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہے وہ اس کے لئے شریعت بنچ کی طرف رجوع کرے۔ وہ بنچ فیصلہ کرے گا کہ وہ قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ خلاف ہونے کی صورت میں اس قانون کو کالعدم قرار دیا جا سکے گا یا اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ کر دی جائیگی۔ جن حضرات، افراد یا اداروں کو حالیہ قوانین سے اختلاف ہو، ہم ان سے گذارش کریں گے کہ ایسے اختلافات کو بحث و نزاع کا موضوع بنانے کے بجائے وہ شریعت بنچ کی طرف رجوع کریں۔ تاکہ ملک میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہ ہو۔ انہیں اس کا یقیناً علم و احساس ہوگا کہ ملک میں تشکیلِ پاکستان کے وقت سے ایسے عناصر چلے آ رہے ہیں (خواہ وہ ملک کے اندر ہوں اور خواہ بیرونِ ملک) جو یہاں مسلسل انتشار پیدا کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو انتشار مذہب کے نام پر پیدا کیا جائے اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہر بہی خواہ پاکستان کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ مملکت کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا۔

(۲۴ فروری ۱۹۷۹ء)

قرآنی قوانین

لِلّٰہِ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ــــ قرآنی قوانین ــــ ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادی اہمیت لکھ کر سامنے آ رہی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔ قیمت فی جلد (مجلد) بیس ۲۰ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ: (۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

از شیخ محمد محمود حافظ

شرعی قوانین

کے نفاذ کے سلسلے میں رابطۃ العالم الاسلامی کی تنبیہ

شیخ محمد محمود حافظ رابطۃ العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ کے سربرآوردہ علماء میں سے ہیں اور رابطہ کے علمی و دینی ترجمان "ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی" کے رئیس التحریر یعنی چیف ایڈیٹر ہیں۔ آپ نے موجودہ معاشرے میں شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں اس ماہنامہ کے تازہ شمارہ بابت صفر ۱۳۹۹ھ کے اداریئے میں رابطۃ العالم الاسلامی کا مؤقف ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبے نے ایک اہم اسلامی شعار کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بہت سے اسلامی اور عربی ممالک، اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس دنیا میں قوت اور عزت چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کے لئے لازمی ہے۔ آج مسلمان جن مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا ہیں اس کی سب بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو دین اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن دین کو اپنے دنیاوی معاملات میں عملی طور پر اپنانے سے دور ہیں۔ اسلامی قانون کی تطبیق ہمارے ایمان اور اعتقاد کے مطابق ہونی چاہیئے جو قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ ہم یہاں اعتقاد اور ایمان کے بارے میں کسی فقہی یا فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ الحمد للہ ہر مسلمان اسلام پر بطور عقیدہ و عمل ایمانِ کامل رکھتا ہے۔

دریں حالات اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں مسلمانوں کے عملی تردد کے پیشِ نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اسلامی عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اپنی زندگی کے روزمرہ کے مشاغل اور کاروبارِ حیات میں اسلامی نظام کی بنیادی باتوں کو کیوں نہیں اپناتے۔ یہ سوال جیسا بھی ہے ایک منطقی سوال ہے کیونکہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنے اعتقاد کے مطابق اس پر عمل بھی کریں۔ ورنہ ہمارے موقف میں تضاد ہوگا۔ اسلامی قانون کے نفاذ کے حالیہ مطالبوں کو جب میں ایک اسلامی مقصد و شعار قرار دیتا ہوں ـــــ جس کے نفاذ کے لئے بہت سے اسلامی ممالک کوشش کر رہے ہیں ـــــ تو میں بعض ایسی صورتوں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نفاذ کے اس مطالبے کے ساتھ ہی سامنے آ رہی ہیں۔

عقلی اور شرعی طور پر یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ جس طرح حضور نبی اکرم (صلعم) آخری نبی ہیں۔ اسی طرح دینِ اسلام

بھی آخری دین ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی چھان پھٹک کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ہم نفاذِ شریعت کے حالیہ مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد صرف شرعی حدود کا نفاذ ہے۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیادی باتیں اور تعلیمات کا اول تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ان کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھی بڑی غیر واضح صورت میں۔ حالانکہ طرزِ عمل اس کے برعکس ہونا چاہیئے تھا۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہر مسلمان اپنے ملک میں اپنی زندگی کے روزمرّہ کے تمام مشاغل پر اسلامی تعلیمات کا نفاذ کرے۔ دوسرا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسلامی ثقافت کو عام کرنے اور اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ مسلمانوں میں اس شعور کو بھی بیدار کیا جائے کہ ایمان و اعتقاد، قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی ابتداء کوڑے لگانے اور ہاتھ کاٹنے سے مشکل ہوگی۔ ان سے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ تمام مسلمانوں پر اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ اسلام قانونِ الٰہی کا نام ہے جو ان کی سعادت اور بھلائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ وہ انسانی تکریم کا محافظ اور امنِ عالم کا داعی ہے۔ وہ ہر مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے مسلمان بھائی کی عزّت کی حفاظت کرے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اس کے مقاصد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے چوری کے ثبوت کے باوجود چوری کی شرعی حد کو نافذ نہیں کیا تھا کیونکہ اس مقصد کے لئے جس قسم کے اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے اس میں کچھ ناہمواری پیدا ہوگئی تھی جس کی بنا پر آپ نے اس شرعی حد کو معطل کر دیا تھا۔ ناہموار معاشرے میں ایک بھوکا شخص احتیاج کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لئے غیر کی روٹی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے۔ اُس وقت وہ کسی دوسرے آدمی کی محفوظ جگہ سے مال چرانے کے باوجود چوری کا مرتکب متصوّر نہیں ہوگا۔

ان گذارشات کی روشنی میں ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ میں کامل احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے ابتداء کے طور پر لازم ہے کہ ہر انسان کے سامنے اسلامی نظام کامل شکل میں اجاگر ہو۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی اکثریت اسلام سے اپنے تعلق کے باوجود اسلامی حقوق و واجبات اور دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عملاً دور ہے۔ یہ صورتِ حالات علمائے کرام سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اسلامی ثقافت اور نظام کو مختلف طریقوں سے معاشرے میں اجاگر کریں۔ اسلامی نظام کی تفصیلات سے ناواقفیت ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس صورتِ حالات پر خاموشی اختیار کی جائے (ترجمہ۔ رفیع اللہ)

—(○)—

طلوعِ اسلام

قطعِ ید وغیرہ سزاؤں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں عام طور پر سعودی عرب کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی خود سعودی عرب کی ایسی اہم ذمہ دار شخصیت کی یہ تصریحات بڑی غور طلب ہیں۔ سعودی عرب میں چوری کی وارداتِ شاذ و نادر ہونے کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں دولت کا سیلاب اُمنڈ رہا ہے۔

—(○)—

قسط (۵)

احتساب

تشکیلِ پاکستان کے بعد جتنی حکومتیں وقتاً فوقتاً برسرِ اقتدار آتی رہیں اُن کے قابلِ اعتراض اقدامات پر طلوعِ اسلام کی طرف سے سخت مؤاخذہ ہوتا رہا۔ ان تاریخی حقائق کی یاددہانی کے طور پر انہیں احتساب کے عنوان سے پیشِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس کی پہلی قسط طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری قسط اگست ۱۹۷۸ء تیسری قسط اکتوبر ۱۹۷۸ء، اور چوتھی قسط جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں۔ اب پانچویں قسط ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی طرف سے اس "احتساب" کی یاددہانی کی جس فراخدلانہ انداز سے پذیرائی ہوئی ہے وہ ہمارے لئے بڑی حوصلہ افزا ہے۔

ہماری جمہوریت

فروری ۱۹۵۵ء سے ماہنامہ طلوعِ اسلام نے ہفت روزہ آرگن کی صورت اختیار کی۔ ۲۶ر فروری کی اشاعت میں اس نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں جو "جمہوریت اور پاکستان" کے عنوان سے شائع ہوا۔ دستور یہ کے اراکین کی "نمائندہ حیثیت" کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا:۔

جہاں تک جمہوریت کے عملی تجربہ کا تعلق ہے اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہاں تشکیلِ پاکستان سے بھی پہلے ایک مجلسِ آئین ساز وجود میں آئی تھی جس کے متعلق لوگوں کو اب اتنا بھی یاد نہیں کہ اس کے ممبروں کو کس نے منتخب کیا تھا اور وہ کس طرح ایوانِ مجلس میں پہنچ گئے تھے۔ سات سال کے عرصے میں اسمبلی نے جو کچھ کر کے دکھایا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے بیزار ہو چکے تھے۔ لوگ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ کسی طرح اس قابوس کو اپنے سینے سے ہٹا کر الگ کر دیں لیکن انہیں بتایا جاتا تھا کہ جمہوری مشینری کی رو سے تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کس قسم کی جمہوریت ہے جس میں ہم ایک شخص کو نمائندہ تو بنا سکتے ہیں لیکن جب ہمیں اس پر اعتماد نہ رہے تو اپنی نمائندگی سے الگ نہیں کر سکتے! وہ پوچھتے تھے ان سے جن سے وہ پوچھ سکتے تھے کہ تم تو کہتے تھے کہ جمہوریت کے معنی ہیں "عوام کی منشا کے مطابق حکومت" لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ عوام چیخ رہے ہیں اور یہاں ان کی کوئی سنتا ہی نہیں، لیکن اس کے باوجود ان سے کہا یہی جاتا ہے کہ نہیں! یہ اسمبلی تمہاری منشا کے مطابق قائم ہے۔ اس کے ممبر تمہارے صحیح نمائندہ ہیں۔ اس کا مرتب کردہ آئین، خود تمہارا بنایا ہوا آئین سمجھا جائے گا۔ تمہیں اپنے بنائے ہوئے زندان میں محبوس رہنا پڑے گا۔

(شمارہ ۲۶ر فروری ۱۹۵۵ء۔ صـ۴)

اور پھر اس نے صورتِ حال کی اصلاح کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا:۔

ہمارے ہاں کی جمہوری مشینری میں اس قسم کی گنجائش کا رکھنا نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی وقت بھی یہ دیکھا جائے کہ قوم کے نمائندے ملت کے مفاد کا تحفظ اور قوم کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے تو انہیں بلا دقت ان کی کرسیوں سے الگ کر کے ان کی جگہ دوسرے نمائندے لائے جا سکیں۔

(ایضاً)

مجرم کون؟

کراچی کی پولیس نے ایک تیس سالہ نوجوان کو خودکشی کے جرم میں گرفتار کیا۔ "مجرم کون ہے؟" کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے پہلے یہ لکھا کہ پولیس کا فریضہ یہی تھا کہ اس نوجوان کو گرفتار کرے اور اب عدالت کا فریضہ بھی یہی ہے کہ اسے سزا دے۔ اور یہ لکھتے ہوئے اس نے معاشرہ کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا:۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت یہ نوجوان شہر میں مارا مارا پھرتا تھا کہ اسے کوئی روزگار مل جائے اور اُسے روزگار نہیں ملتا تھا۔ جس وقت وہ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے باوجود بھوکے پیٹ کوئی چھت تلاش کرتا تھا کہ جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے۔ تو کیا اس وقت بھی کسی کا فریضہ تھا یا نہیں کہ اس کے لئے روزگار مہیا کرے؛ روزگار نہیں ملتا تو اس کے کھانے کے لئے روٹی اور رہنے کے لئے مکان کا انتظام کرے۔ اس وقت اس چودہ پندرہ لاکھ کی بھری بستی میں اس کی مصیبت میں اس کا ہاتھ بٹائے اور اس کی پریشانی میں اس کا ساتھ دے سکے۔ لیکن جب اس نے تنگ آکر ٹھکرا دی تو بہت سے فرائض بیدار ہوگئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقدامِ خودکشی جرم ہے لیکن (مذکورہ صدر حالات میں) خودکشی کرنے والا اس جرم کا اتنا ذمہ دار نہیں جتنا ذمہ دار وہ معاشرہ ہے جو اسے اس اقدام پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت کے اٹل قوانین (جو عدل کی صحیح بنیادوں پر قائم ہیں) اس فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں......... اور آپ کو معلوم ہے کہ فطرت کی عدالت سے اس جرم کی سزا کیا ملا کرتی ہے؛ وہ ان تمام خوشحالیوں کو چھین لیا کرتی ہے جو اس نے عطا کر رکھی ہوں (بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٦٧/٢٧) اور آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والوں کو زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا کرتی ہے۔ (وَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ١١/٨٢)۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(شمارہ ۵ ر مارچ ۱۹۵۵ء۔ صہ ۵-۴)

دفتری نظام

ایک مملکت کے کاروبار میں دفتری نظام کو بڑی بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جہاں دفتری نظام بدنظمیوں اور بدعنوانیوں کا شکار ہو وہاں مملکت کے عوام کی پریشانیوں کی کیا کیفیت ہوگی اور خود نظامِ مملکت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ پاکستان اسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ چنانچہ "دفتری بدنظمیاں" کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے اس موضوع پر اپنے المقالہ افتتاحیہ میں قلم اٹھایا اور لکھا:۔

اگر ہم مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں اپنی حکومت (پاکستان) کے دفاتر کو دیکھتے ہیں تو بلا مبالغہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی حالت سکھوں کی ان ریاستوں سے بھی بدتر ہو چکی ہے جنہیں تقسیم سے پہلے، بدنظمی کے لئے بطور ضرب المثل پیش کیا جاتا تھا۔ ہم یہ بات محض سنی سنائی

نہیں کہہ رہے بلکہ برسوں کے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے، دفاتر میں اہل کار اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ وہ عوام کی ضروریات کو پورا کرنے اور ان کے معاملات کو سلجھانے میں ان کی معاونت کریں۔ لیکن ہمارے دفاتر میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں حاکم کی حیثیت سے ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ پبلک کا جو آدمی میرے پاس آئے اس پر حکومت کردی۔ چنانچہ آپ کسی دفتر میں جائیے، سب سے پہلے آپ کو اسی "تھانیدارانہ" ذہنیت سے واسطہ پڑے گا۔

(شمارہ طلوعِ اسلام بابت ۱۹ مارچ ۱۹۵۵ء - صـ۳ـ)

اس کے بعد وہ اربابِ حکومت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لکھتا ہے :۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صورتِ حالات کی اہمیت کا کسی کو اندازہ نہیں اور ان کی اصلاح کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ہمارے اربابِ بست وکشاد "بڑے بڑے مسائل" کے سلجھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن نہیں سمجھتے کہ ان مسائل کے سلجھانے میں تگ وتاز کرنے کا کچھ فائدہ نہیں اگر افرادِ مملکت کے معاملات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جائیں اور انہیں نہ ضروریاتِ زندگی کی طرف سے آرام نصیب ہو، نہ قلبی و ذہنی احتیاجات کی طرف سے اطمینان۔ یاد رکھئے! اچھی حکومت وہی ہے جس کے دفاتر اچھے ہوں اور دفاتر وہی اچھے ہوتے ہیں جو عوام کی ضروریات پوری کرتے اور ان کے معاملات سلجھانے میں ہر قسم کی مدد دینا اپنا سرکاری فریضہ سمجھیں۔ اور سمجھیں ہی نہیں بلکہ اس فریضہ کو ادا بھی کریں۔ اگر ہمارے دفاتر میں یہ تبدیلی نہ ہوئی تو حکومت بھی محکم بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے کہ :

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(ایضاً - صـ۴ـ)

مشرقی پاکستان میں

مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کی برطرفی کے بعد جب وزیر اعظم محمد علی دوبارہ ڈھاکہ گئے تاکہ مولوی صاحب سے مفاہمت کرکے انہیں دوبارہ وزارت سونپ دیں تو اس پر ایک سنجیدہ سپردِ قلم کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے تحریر کیا کہ :۔

جہاں تک مولوی فضل الحق کی حمایت کا تعلق ہے یہ روش بڑی افسوسناک ہے۔ تعجب ہے کہ وہی وزیر اعظم اس کے مرتکب ہو رہے ہیں جنہوں نے نہ صرف مولوی صاحب کو غدار کہا تھا بلکہ دلائل و شواہد سے غدار ثابت کیا تھا۔ جب سے وزیر اعظم نے مولوی صاحب پر یہ الزام لگایا ہے اس وقت سے لے کر اب تک مولوی صاحب کے رویہ میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی جس سے ظاہر ہو کہ انہوں نے ماضی سے توبہ کرلی ہے۔ یا وہ آئندہ غدارانہ حرکات سے مجتنب رہیں گے۔ جو کچھ وزیر اعظم نے مولوی سے متعلق فرمایا تھا، اس کا عشرِ عشیر بھی کسی عام شہری سے متعلق ہوتا تو وہ یقیناً عدالت کے کٹہرے میں کھڑا

ہوتا۔ لیکن مولوی صاحب سے بازپُرس کرنا تو درکنار، انہیں پھر سے وزیرِ اعلیٰ بنایا جا رہا ہے۔ (شمارہ طلوعِ اسلام۔ بابت ۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء۔ صفہ)

اور اس کے ساتھ ہی ایسے غلط اقدام کے خطرناک نتائج سے خبردار کرتے ہوئے اس نے لکھا:۔

مولوی فضل الحق کی بحالی کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں جسے یونہی نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کی ساٹھ دنوں کی حکومت میں مشرقی پاکستان کا دامنِ امن و امان ہی تباہ نہیں ہوا تھا، بلکہ پاکستان کے حصے بخرے ہو جانے کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ اگر جرأت سے کام لے کر انہیں بروقت گدی سے اتار نہ دیا گیا ہوتا تو ملک کے لئے بڑے خوفناک نتائج نکلتے ......
اگر مصلحتِ وقت کا تقاضا پارلیمانی احیاء ہی ہے تو اس کے لئے یہ کہاں سے لازم آتا ہے کہ آدھے سے زیادہ پاکستان کو ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جائے جسے خود وزیرِ اعظم غدار قرار دے چکے ہیں اور ملک اسے بالعموم غدار سمجھتا ہے۔ (ایضاً)

درویشوں سے استمداد

مشرقی پاکستان میں پارلیمانی زندگی کی بحالی کے سلسلے میں جب وزیرِ اعظم محمد علی ڈھاکہ میں تھے تو اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے وہاں ایک درویش سے خفیہ ملاقات کی اور انہیں ڈھاکہ سے شاہانہ اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ ایک عظیم مملکت کا وزیرِ اعظم اور درویشوں سے، برائے استمداد، خفیہ ملاقاتیں! طلوعِ اسلام کو لکھنا پڑا کہ:۔

اس سے پہلے اتنا ہی سنا تھا کہ بڑے بڑے لوگ سٹہ کا نمبر معلوم کرنے کے لئے فقیروں کے ہاں جاتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہے اور اب امورِ سلطنت کے لئے بھی ان بارگاہوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اب حافظؒ کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ:۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا! مخروش

تاریخ شاہد ہے کہ جب حکومتوں کے فیصلے خانقاہوں سے ہونے لگے تو سلطنتیں مٹنا شروع ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خانقاہوں کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ عمل سے بیگانہ اور جدوجہد کے نتائج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ بہرحال اب بھی اگر کسی کو مملکتِ پاکستان کے "اسلامی" ہونے میں شبہ ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!
(شمارہ ۲ اپریل ۱۹۵۵ء۔ صفہ ۱۶)

ایک مدّت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیّت

شائع ہو گئی۔

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سُنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے، جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے، کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے بر عکس:—

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- مادّیت جدلیّت کا فلسفہ اضداد کی بنیادیں کس طرح نا استوار ہیں۔
- ربوٰا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتابت، اوفسٹ کی چھپائی ہیں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔

ضخامت سوا چار سو صفحات — سنہری جلد — قیمت فی جلد پچاسؔ روپے

محصول ڈاک — تین روپے

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور | ملنے کا پتہ | مکتبہ درین دانش چوک اُردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لندن (انگلینڈ)

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز
(فون 30890) عقب اڈہ لاریاں (مائی دی جھگی)

کراچی ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان - آغا محمد یونس صاحب - رفیقی لین صدر - بالمقابل دی آئی پی مین گیٹ - پشاور سٹیڈیم - باڑہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز ہر روز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خاں - نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ۔

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔

لیبیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب - رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب - سرکلر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسب ذیل ہیں:-
ہر روز علاوہ جمعہ:- شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

محمد اسلام - کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز / الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

باسمہٖ تعالیٰ

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

یہ تھا نظامِ مصطفیٰؐ!

عیدِ میلاد النبیؐ (۱۹۷۹ء) کی تقریبِ سعید پر
پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تھا نظامِ مصطفٰیؐ!

عالمِ انسانیت کی جس عظیم ترین ہستی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تقریب میلاد منانے کے لئے ہم آج اپنے لئے سرمایۂ سعادت اور توشۂ آخرت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے تذکارِ جلیلہ کی عالمگیریت کے متعلق علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ وہ، :

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

حضور نبی اکرمؐ کی شان میں وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ خود ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی باری تعالےٰ نے کہا تھا کہ اے رسول! ہم تمہاری رفعتِ شان کے تذکرہ کو انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچا دیں گے۔ بارگاہِ رسالتمآبؐ میں، اپنے تو ایک طرف، غیروں تک نے جن شاندار الفاظ میں ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کیا ہے اسے یکجا کیا جائے تو اس سے ضخیم مجلّدات مرتب ہو جائیں۔ لیکن میں اپنے آج کے خطاب کا آغاز ایک ایسے اعتراف سے کرنا چاہتا ہوں جو تازہ ترین بھی ہے اور عظیم ترین بھی۔ حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو (غالباً) ابھی تک پاکستان میں نہیں پہنچی۔ کتاب کا نام ہے۔ "تاریخ کی ایک سو عظیم ترین شخصیتیں" اور اس کا مؤلف ہے۔ (H. HART) جو فلکیات اور تاریخ کا عالم ہے۔ اس میں اس نے تاریخ انسانیت (یعنی کسی خاص قوم، خاص ملک یا خاص زمانہ کی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت کی تاریخ) کی ایسی ایک سو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے معیار کی رُو سے، عظیم ترین اور عدیم النظیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں سب سے اوپر (پہلے نمبر پر) کس شخصیت کا نام نامی ہے؟ اس ذاتِ گرامی کا جسے خالقِ کائنات نے رحمۃ للعالمینؐ کہہ کر پکارا اور جس کی شان میں رفعنا لک ذکرک ارشاد فرمایا۔

ہارٹ نے کہا ہے کہ میں نے اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کا اسمِ گرامی اس لئے سرِ فہرست رکھا ہے کہ:۔

"تاریخِ عالم میں وہ واحد شخصیت ہے جسے مذہب اور دنیاوی امور دونوں میں عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی۔

اس نے لکھا ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں میں نے کسی شخصیت کے انفرادی کردار کو معیار نہیں قرار دیا۔ معیار یہ پیش نظر رکھا ہے کہ اس نے پوری تاریخ اور دیگر انسانوں کو کس حد تک متاثر کیا۔ اور اس معیار کی رو سے مجھے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بلند ترین سطح پر فائز نظر آتے ہیں۔ ہارٹ نے حضور نبی اکرمؐ کی عدیم النظیر کامیابی کے سلسلہ میں مذہب اور امور دنیا کا الگ الگ ذکر اس لئے کیا ہے کہ ان کے ہاں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں جن کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں۔ لیکن حضورؐ نے اقدارِ خداوندی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط تھا اور جس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

ہمارے ہاں چونکہ اسلام، دین کے بجائے مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لئے رسول کی بعثت کا مقصد وعظ و نصیحت یا نماز روزہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب جو "نظام مصطفیٰ" کی اصطلاح عام ہوئی ہے تو اس میں بھی اس نظام کا کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں لایا گیا۔ بات نماز روزہ یا تعزیرات تک ہی محدود رکھی جاتی ہے۔

رسول کی بعثت کا مقصد

ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا تھا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے:۔

> رسول اس لئے آتا ہے (یعنی آتا تھا) کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے (مضراب وحی سے) اس کے نفس قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (علیہ الرحمۃ) اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں:۔

> چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی اس لئے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے[1]۔ مگر چونکہ ہمارے

---

[1] شاہ صاحب کے اس خیال سے کلیتہً متفق نہیں۔ دین شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے اس لئے ہر رسول کی بعثت کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی رسول کے زمانے میں جو خرابی سب سے زیادہ فساد انگیز ہوتی تھی وہ اس کے استیصال کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ قرآن کریم شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بھی ملک عظیم (عظیم مملکت) عطا ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ مملکت کے فرائض اور ذمہ داریاں نماز روزہ تک محدود نہیں ہوتیں اگرچہ یہ بھی اس کے نظام کے اہم ستون ہوتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی اور معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضورؐ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا۔ (جو ان خرابیوں کا سرچشمہ تھیں)۔ (جلد اوّل۔ صـ۶۶)

بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک حضورؐ مکہ میں رہے، اسلام کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھا لیکن جب مدینہ میں مملکت حاصل ہوئی تو سیاسی، معاشرتی، معاشی شعبوں کو مذہب کے دائرہ میں لے آیا گیا۔

حضورؐ کی مکّی زندگی

یہ قطعاً غلط ہے۔ نبوت کے آغاز ہی سے حضورؐ کے پیش نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا کیونکہ قرآن کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا:۔

یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے حکومتِ خداوندی کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہو گی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

مقصدِ رسالت

اسی ضمن میں تاریخ الکامل ہی میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ لکھا ہے:۔

شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبوی میں حاضر تھے کہ قبیلہ عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصا ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضورؐ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ: لکل قول حقیقۃ۔ وما حقیقۃ قولک؟ ہر دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور بھائی عیسےٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کر دوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا، جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہو گا۔ آپ نے فرمایا:۔

نعم النصر والتمکین فی البلاد

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔

اس سے واضح ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضورؐ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا

جا سکے جس کی نظیر کہیں ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔

یہ تو میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس مختصر سے وقت میں اس نظام کے تمام گوشوں کو آپ کے سامنے لا سکوں۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کے دو ایک اہم پہلوؤں کی خفیف سی جھلک آپ کو دکھا دوں۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظام (یعنی دینِ خداوندی) کے ماحصل کو ایک شعر میں اس جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس پر غور کرنے سے بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

میں مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ اس نظام نے حاکم و محکوم کا فرق کس طرح مٹایا اور سائل و محروم کا وجود کس طرح ختم کیا۔ قبل اس کے کہ میں ان فردوس بداماں مناظر کو آپ کے سامنے پیش کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نظام کا آغاز حضور رسالت مآبؐ کے دستِ مبارک سے ہوا تھا لیکن (اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) اس کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد مکہ میں حضرت سہیل بن عمرؓ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ:-

خدا کی قسم۔ اسلام کا مقصد تکمیل تک پہنچے گا۔ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ (آپ نے فرمایا تھا) لوگو! میرے ساتھ لا الہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرماں ہو گئے عجم باجگذار۔ خدا کی قسم، تم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔

(تاریخ الکامل)

اس دعویٰ کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے ہاتھوں ہوئی تھی، بالخصوص حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں۔ لہٰذا، میں جو مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا ان کا تعلق محمدؐ رسول اللہ کے عہدِ سعادت کے عہد ہی سے نہیں بلکہ (قرآن کے الفاظ میں) والذین معہٗ کے زمانے سے بھی ہو گا۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس نظام کی تکمیل اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق، صدرِ اوّل میں ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم تو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ نظام ہے۔ جن اصول و اقدار کے مطابق یہ نظام متشکل ہو گا، وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن اس کی جزئیات طرق و اسالیب مرورِ زمانہ کے ساتھ عند الضرورت بدلتے جائیں گے۔ لہٰذا جوں جوں انسانی زندگی کے تقاضے وسیع ہوتے جائیں گے، یہ نظام بھی اس کے مطابق وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآنی راہ غایٔ حدود و فراموش ہے، اسی طرح اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام بھی قیود نا آشنا ہے۔ اُکُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا (13/35) تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (14/25)۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند   بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ!

(٠)

اب میں اس نظام کے پہلے گوشے کی طرف آتا ہوں۔ یعنی اس امر کی وضاحت کی طرف کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو گا، نہ محکوم۔ انسانی نظامِ مملکت میں (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جب

حکومت قائم ہو گی تو یہ کیسے ممکن ہو گا کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ حاکم اور محکوم کے بغیر تو حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا! لیکن انسانی نظام اور خدائی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ نظامِ خداوندی میں، اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔

نہ حاکم نہ محکوم

اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے، اور قوانین ایسے جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ خود خدا کے نازل فرمودہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، اور جسے ہم حکومت کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرماں روائی کو بطیبِ خاطر قبول کر دیں ان پر ان کا اطلاق ہوگا۔ انہی کو اُمتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ ان قوانین کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تغیر و تبدّل یا حک و اضافہ نہیں ہو سکے گا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس نظام میں نہ صرف یہ کہ کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوگا بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس کا کلی اطمینان ہوگا کہ جن قوانین کی اطاعت انہوں نے بطیبِ خاطر اختیار کی ہے ان میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہوگا۔

فرماں روائی صرف قانون کی

جہاں تک محکومیت کا تعلق ہے تاریخِ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ سیاسی محکومیت کے مقابلہ میں مذہبی پیشواؤں کی محکومیت زیادہ متشدد اور سخت گیر ہوتی ہے۔ اس نظام میں جہاں سیاسی محکومیت کو ختم کیا گیا وہاں، مذہبی پیشوائیت کے اقتدار ہی کو نہیں، اس کے وجود تک کو معدوم کر دیا گیا۔ قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا ہے کہ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (9/31) "انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے"۔ اس آیت کی تفسیر میں حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی نہایت واضح اور تابناک ہے:۔

> حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ "عدیؓ! اس بت کو گلے سے اتار پھینک"۔ اس وقت آپ سورۃ براۃ (توبہ) تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ"..... تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! ہم ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا! مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کر دیتے ہیں اور تم حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں اور تم حرام سمجھنے لگتے ہو۔ میں نے اقرار کیا! بیشک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا۔ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔ (جامع بیان العلم۔ ابن عبد البر)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنینؓ! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

یاد رکھو! تم سے پہلی امتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔۔۔۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ)

یوں اس نظام نے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو ختم کر دیا۔ اس میں قانونِ خداوندی کا نفاذ بھی مملکت کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تشریح و تعبیر کا فریضہ بھی مملکت ہی ادا کرتی تھی۔

اس نظام کی اوّلیں مرکزی اتھارٹی حضور نبی اکرم ﷺ کو ارشاد تھا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ "ان کے معاملات کے فیصلے قرآن مجید کے مطابق کرو"۔ حضورؐ نے اس کتاب خداوندی کے مطابق سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ عمر بھر اسی کے مطابق فیصلے فرماتے رہے، اور دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، پوری اُمت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ ۔ کتاب اللّٰہ۔

(بخاری ۔ باب حجۃ الوداع)

مَیں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے ۔۔۔ وہ ہے کتاب اللہ،

حضورؐ کے بعد، آپ کے سچے جانشین اپنے زمانے میں اس مسلک پر قائم رہے کیونکہ یہ ارشادِ خداوندی ان کے سامنے تھا کہ:۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اپنے لئے دعا یہ مانگی تھی کہ:۔

یا اللہ! مجھے تفکر و تدبرِ قرآن عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔

اور سامعین سے کہا تھا کہ:۔

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اس پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔

(شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۱۶۰)

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ "میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری بات مانیں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ آپ اس کے مطابق مشورہ دیں"۔ آپ کے عہد میں عمالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلیں معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن میں تفقہ کر سکتے ہیں۔ جب مکہ کے گورنر، نافع بن عمرؓ بن عبد الحارث نے عبد الرحمانؓ بن ابزی کو وادی کا والی مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ شخص قرآن مجید میں تفقہ کرتا ہے اور دین کے فرائض کا علم رکھتا ہے۔ تو آپ بہت خوش ہوئے۔ قرآن کریم کی اہمیت و عظمت آپ کے رگ و پے میں اس حد تک سرایت کئے ہوئے تھی کہ جب آپ کو وہ زخم لگا ہے

جس سے آپ کی شہادت واقعہ ہوگئی تو کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آچکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔ تو آپ نے ان سے کہا کہ:۔

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردد نہ ہوں۔ جہنم کی آگ آپ کو چھو نہ سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کہا کہ "بھائی! تمہارا علم اس بارے میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف سے نچھاور کر دیتا۔" آپ نے یہ الفاظ سنے تو حضرت ابن عباسؓ نے جو آپ کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ "یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حقوق برابر عطا کرتے تھے۔" یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا! ابن عباسؓ! کیا تم میرے بارے میں اس امر کی شہادت دو گے؟ وہ خاموشی سے سنتے رہے تو آپ نے دوبارہ کہا کہ کہو ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اسکی گواہی دونگا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے، حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کے الفاظ میں، اس کی عام گواہی دی کہ:۔

عمرؓ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہ۔

میں نے ان حضرات (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے تفقہ کا ذکر اس لئے خاص طور پر کیا ہے کہ اسلامی مملکت میں، فقہا اور علماء کا الگ وجود نہیں ہوتا تھا۔ سربراہِ مملکت اور عمالِ حکومت ہی فقہا اور علماء ہوتے تھے۔ اس دور میں نہ اُمت میں الگ الگ فرقے تھے، نہ ان کی الگ الگ فقہیں ـــــ ایک اُمت تھی ان کی ایک مرکزی اتھارٹی ـــــ وہی اتھارٹی قرآنی قوانین نافذ کرتی تھی اور وہی ان قوانین کی فقہی تعبیرات کا حق رکھتی تھی۔ کسی اور کو ان کی تعبیرات اور تشریحات کا حق اور اختیار نہیں تھا، بعینہٖ جس طرح آج مملکت کے قوانین کی تعبیرات کا حق نمائندگانِ حکومت کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ چونکہ مملکت کی بنیاد کتاب اللہ پر تھی اس لئے کتاب اللہ مملکت کے گوشے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ امام ابن حزم کی تحقیق کے مطابق عہدِ فاروقی میں قرآن مجید کے کم و بیش ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔ قرآنی تعلیم کی اس قدر عام اشاعت کا نتیجہ تھا کہ اُمت قرآنی اور غیر قرآنی امور میں خود امتیاز کر سکتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ:۔

حاکم کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ تعالےٰ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ تعالےٰ نے روکا ہے۔

امورِ مملکت کے فیصلے تو قرآن مجید کے اصول، اقدار اور احکام کے مطابق ہوتے تھے جو غیر متبدل تھے لیکن ان کی جزئیات کا تعین اور ان کے نافذ کرنے کا پروگرام باہمی مشاورت سے طے پاتا تھا۔ اس مشاورت

وحی اور رائے میں فرق

میں بھی اصول ہی کارفرما ہوتا تھا کہ یہ مشورے حدود اللہ کے مطابق ہوں۔ جب عراق کی زمینوں کے متعلق اہم سوال زیرِ بحث آیا (جس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) تو حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو تقریر فرمائی — اس میں کہا:-

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی اور بعض نے مدافعت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس باب میں آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ "اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور کہا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا۔ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت نہ بناؤ"۔ عمرؓ کی رائے ہی نہیں۔ کسی ایک اسلامی مملکت کے وضع کردہ قوانین بھی ابدی نہیں ہوتے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بعد میں آنے والی اسلامی مملکت تبدیلی کر سکتی ہے۔ اس اہم اصول کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کی رُو سے آپ نے فرمایا:-

بیشک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا ہے بنیادی طور پر اس کا تعلق قانون سازی کے اصول سے ہے لیکن بغور دیکھئے تو اس میں وہ عمیق نکتہ بھی پوشیدہ ہے جو دین کی بنیاد ہے یعنی اس میں ساری اہمیت اصولوں کو حاصل ہوتی ہے شخصیتوں کو نہیں۔ قرآن تو آیا ہی شخصیت پرستی کو مٹانے کے لئے تھا۔

(۰)

شخصیت پرستی

"شخصیت پرستی" سے میری نگاہ بلا ساختہ اس عظیم واقعہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جس کی مثال دنیائے مذاہب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی، شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے، خواہ یہ

...... شخصیت پرستی، دنیاوی حکمرانوں کو "ظل اللہ علی الارض" (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور خواہ روحانی پیشواؤں کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی دوسری شکل، پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ دنیاوی حکمرانوں کی محکومیت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کرسکتی ہیں لیکن روحانی پیشوائیت کی محکومیت کا تسلط انسان کے قلب و دماغ اور روح پر ہوتا ہے۔ اگر کسی (زندہ یا مردہ) "حضرت صاحب" کی شان کے خلاف خیال تک بھی ان کے کسی معتقد کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے۔ لرزتا ہے کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے وہ ان کے حضور (اگر زندہ ہوں تو ان کی بارگاہ میں اور وفات پاچکے ہوں تو ان کے مزار کے پائنتی کی طرف سجدہ ریز ہوکر) روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے، معاف کر دیجئے، ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ دین اور دنیا میں کہیں کا نہیں رہوں گا ——— سوچئے کہ کیا شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے فروتر کوئی اور صورت بھی ہوسکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآن کریم جو انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا، اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی! خود حضورؐ رسالتمآب کا (زبانِ وحی کی رو سے) یہ ارشاد کہ انا بشر مثلکم (میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں) شخصیت پرستی کی جڑ پر تبر کی ضرب کاری کے لئے تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اس کی جو مثالیں پیش کیں انہیں آپ سیرتِ طیبہ پر میری پیش کش، معراجِ انسانیت، میں دیکھئے۔ لیکن میں اس وقت اس باب میں حضورؐ کی سیرتِ اقدس کی کوئی مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضورؐ نے اپنی تعلیم و تربیت سے اپنے متبعین میں جو قلبِ ماہیئت پیدا کر دی تھی، اس سے ان حضرات کی کیفیت کیا ہوگئی تھی۔ (جیسا کہ قرآن کریم سے واضح ہے) نبی اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کے وقت، ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے خصوصیت سے نماز ادا کرتے ہیں۔

طبعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ بیعتِ رضوان کا درخت ایک فردوس بداماں واقعہ کی یاد تازہ کرتا تھا اور صحابہؓ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے، محض اس کے نیچے نماز ادا کرتے تھے۔ نظر بظاہر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن اس دست پروردۂ نبوت کی نگاہِ حقیقت شناس اس معصوم سی ابتدا سے آنے والے خطرات کو بھانپ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس درخت کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو رہی ہے جو آگے چل کر خطرناک شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ علاج تو اس کا یہی تھا لیکن ایسا کرنے کے لئے، اور تو اور، خود اپنے جذبات کا بھی جس جرأت سے مقابلہ کرنا تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر دین کا تقاضا جذبات پر غالب نہ آجاتا تو عمرؓ ابن خطاب، فاروقِ اعظمؓ کس طرح بن جاتا۔ چنانچہ

آپ نے پوری ہمت اور جرأت سے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کٹ گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ:-

انما ھلک من قبلکم بھذا یتبعون اٰثار انبیاءھم فاتخذوھا کنائس وبیعا۔

تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے محسوس آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنا لیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:-

اراکم ایھا الناس رجعتم الی العزیٰ۔

تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے تم بت پرستی کی طرف لوٹ رہے ہو؟

---(۰)---

کیسی دُور رس نگاہ تھی اس متعلمِ درس گاہِ نبوتؐ کی؟ آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو کٹوا دیا، لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمت اس خطرہ کے بیجوں کی جھولیاں بھر بھر کے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سو سو پرستش گاہیں وجود میں آجائیں جہاں اس توحید کی مدعی اُمت کے سر اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے۔ بہرحال، عمر فاروق رضؓ ان بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی جڑ کاٹ کر اُمت کے لئے ایک نظیر قائم کر دی تھی۔ لیکن جب اُمت نے قرآن ہی کو چھوڑ دیا تو اس قسم کے نظائر ان کے لئے کس طرح عبرت آموز ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں دو ایک اور واقعات بھی عبرت آموز ہیں:-

ایک دفعہ آپ حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس کی طرف لوگ دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ لوگ تبرکاً اس میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو لوگوں کو ٹوکا اور کہا کہ جس شخص کو اس مسجد کے قریب نماز کا وقت آجائے وہ تو اس میں جا کر نماز پڑھ لے۔ لیکن بہ تکلف اس میں کوئی نماز نہ پڑھے۔

آپ نے ایک دفعہ سنا کہ ایک قبر ہے جسے لوگ حضرت دانیالؑ کی قبر سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس قبر کو چھپا دیا جائے۔

میں ان واقعات کے بعد اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

---(۰)---

بات میں یہ کر رہا تھا کہ نظامِ خداوندی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جاتی ہے۔ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی نہیں۔ لیکن یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ قانون خواہ کیسا ہی بلند و بالا ہو، اس کے انسانیت ساز نتائج اسی صورت میں برآمد ہو سکتے ہیں کہ اس قانون کو نافذ کرنے والے عدل کی میزان کو تھامے ہوئے ہوں۔ عدل کسے کہتے ہیں اسے قرآن کریم نے ان چار الفاظ میں منضبط کر کے سمجھا دیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک عظیم رسول، حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاداؤدؑ!

إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ (۳۸/۲۶)" اے داؤد!

عدل

ہم نے تمہیں ملک میں صاحب اقتدار اس لئے بنایا ہے کہ تم لوگوں کے امور کے فیصلے الحق (وحی خداوندی) کے مطابق کرو، اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات، میلانات، خواہشات، کا اتباع نہ کرنے لگ جاؤ۔" لہٰذا عدل سے مراد یہ ہے کہ صاحب اقتدار، قانون کے نفاذ میں اپنے رجحانات اور جذبات کو یکسر الگ رکھے اور انسان اور انسان میں کسی قسم کی تفریق اور تمیز نہ کرے۔ یہ ہے وہ بنیادی خصوصیت جس سے یہ نظام، عدیم النظیر قرار پاتا ہے۔ جب اسلامی نظام قائم ہوا تھا تو قانون نافذ کرنے والے، اپنے جذبات اور میلانات کو کس طرح الگ رکھتے تھے، کتب سیر و آثار میں اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں، لیکن قلتِ وقت کی وجہ سے میں اس وقت ان میں سے صرف چند ایک پیش کر سکوں گا۔

سب سے پہلے سیرت طیبہ کے ایک واقعہ کو لیجئے جو ہے تو مختصر سا لیکن اس میں قانون اور ذاتی جذبات کو نکھار کر الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ حضورؐ کی انصاف پروری اور عدالت گستری اس قدر مسلّم اور اس پر اعتماد تھی

یہودی کی لڑائی

کہ یہودی بھی، باوجود اس قدر مخالف ہونے کے اپنے اہم مقدمات حضورؐ کی عدالت میں لایا کرتے تھے۔ آپؐ نے قتل کے ایک مجرم کو موت کی سزا کا حکم سنایا۔ جلاد اس کے سر پہ تلوار لئے کھڑا آخری اشارے کا منتظر تھا کہ اتنے میں اس مجرم کی ایک خورد سالہ بچی روتی، چیختی، چلاتی دوڑی دوڑی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر فریاد کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔ اس کی آہ و فغاں اس قدر رقت آمیز تھی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ سزائے موت کا حکم واپس لے لیں گے۔ لیکن آپؐ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔ بعد میں صحابہؓ نے پوچھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، اس کے باوجود آپؐ نے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ متضاد کیفیت کیوں تھی؟ اس کے جواب میں آپؐ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ تاریخ میں کلاسک کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ: "اس وقت محمدؐ ابن عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی اور محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ خدا کا قانون نافذ کر رہا تھا" محمدؐ ابن عبداللہ اور محمدؐ رسول اللہ کا یہی وہ نازک فرق ہے جو قانون کی بالادستی کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے۔

اور یہ فرق حضورؐ کی ساری زندگی میں درخشاں ستاروں کی طرح جگ مگ، جگ مگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جنگ بدر کے قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابوالعاصؓ بھی تھے (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) فیصلے کے مطابق ان قیدیوں کا زرِ فدیہ طلب کیا گیا تو حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے ایک ہار بطور فدیہ بھیجا۔ ہار سامنے آیا تو گذشتہ تیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے آپؐ کی نگاہوں

بیٹی کا ہار

کے سامنے آگئے۔ یہ وہ ہار تھا جسے حضورؐ نے اپنے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کو تحفۃً دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے یہی ہار حضرت زینبؓ کی شادی پر والہانہ تحفہ کے طور پر بیٹی کے زیب گلو کیا تھا۔ کانچ کے اس ہار کی قیمت تو کچھ ہو سکتی تھی لیکن محبت اور رفاقت کے مقدس جذبات کی ایک دنیا اس میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ آپؐ فوج کے کمانڈر انچیف بھی تھے اور سربراہِ مملکت بھی۔ آپؐ بلا تامل اس ہار کو ڈھیر

سے الگ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے اصولِ عدل پر زد پڑتی تھی۔ آپ نے مجلسِ مشاورت کو اس بار کی تاریخ سے آگاہ کیا اور کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اسے بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ ان کی تصویب سے بار واپس کیا گیا۔ بات تو چھوٹی سی ہے لیکن جو اصول اس میں کارفرما ہے وہ قیامت تک ہر صاحبِ اقتدار کے لئے اسوۂ حسنہ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد اس واقعہ کو سامنے لائیے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخر ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ واقعہ متعلق ہے حضرت زید رضؓ سے۔ حضرت زید رضؓ ایک غلام تھے، جسے حضورؐ نے آزادی عطا فرمائی تھی۔ ایک غلام کا آزاد ہو جانا ہی کچھ کم باعثِ شرف نہ تھا کہ اس کے بعد آپ نے اسے منہ بولا بیٹا بنا[1] لیا اور اس کی پرورش خود اپنے گھر میں کی۔ اصولِ مساوات اور تکریمِ آدمیت کی عملی مثال پیش کرنے کی غرض سے آپ نے اس کی شادی بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون، اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینبؓ سے کر دی۔ سوءِ اتفاق کہ وہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور حضرت زید رضؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ آپ غور کیجئے کہ حضرت زید رضؓ کا یہ ارادہ آپ پر کس قدر شاق گذرا ہوگا۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ حسب و نسب کو طرۂ امتیاز سمجھنے والے قریش اس شادی پر پہلے ہی معترض تھے۔ اس کی ناکامی پر انہیں یہ کہنے کا موقعہ مل جاتا کہ ـــــ کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے! ـــــ آپؐ نے حضرت زید رضؓ سے کہا کہ:

حضرت زید رضؓ

أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمائیے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جا رہا ہے۔ کہنے والا خدا کا رسول ہے۔ جس پر ایمان لانے سے حضرت زید رضؓ مسلمان ہوئے ہیں۔ کہنے والا سربراہِ مملکت بھی ہے۔ کہنے والا محسن ہے جس نے حضرت زید رضؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔ کہنے والا بمنزلہ باپ کے ہے۔ اور پھر کہنے والا اس معزز خاتونؓ کا برادرِ بزرگ بھی ہے۔

کہئے کہ اس کے بعد حضرت زید رضؓ کو اس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ آپؐ کے اس فرمان کی خلاف ورزی کر سکے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سوچئے کہ آج اگر کسی پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کا محکوم، کسی محسن کا ممنونِ احسان، کسی باپ کا بیٹا، کسی بڑے کا چھوٹا ایسا کرتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی! لیکن وہاں کیا ہوا۔ نہ کہنے والے کے ماتھے پر کوئی شکن آیا نہ زید رضؓ پر کوئی عتاب نازل ہوا۔ نہ باہمی تعلقات میں کوئی فرق آیا۔ اس لئے کہ وہاں تو سکھانا یہ مطلوب تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے ذاتی فیصلوں کا پابند بنائے خواہ جذبات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضورؐ کا یہ حکم نہ بحیثیت رسول تھا، اور نہ بمنصبِ سربراہِ مملکت۔ یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ اور بتانا یہ مقصود تھا کہ مشورہ دینے والے کی پوزیشن کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے نہ ماننے سے کسی قسم کا عتاب اور سرزنش تو ایک طرف، دل میں ذرا سی کدورت اور رنجش بھی نہیں آنی چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے قانون، احکام اور مشورہ کے اسی فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اس واقعہ کو اپنے اوراق

---

[1] قرآنِ مجید نے اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا۔

میں محفوظ کیا ہے تاکہ یہ آنے والوں کے لئے دلیلِ راہ بنے ـــــ لیکن آپ غور کیجئے کہ آج غیر تو غیر خود حضورؐ کے نام لیواؤں میں سے کتنے ہیں جو اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اور یہ تو پھر بھی حضورؐ کے ایک عزیز کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں بریرہؓ نامی ایک لونڈی تھی جو آزادی حاصل ہونے کی بنا پر اپنے سابقہ شوہر حضرت مغیثؓ سے الگ ہو گئی تھی۔ حضرت مغیثؓ کی درخواست پر حضورؐ نے بریرہ سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے کو واپس لے لے۔ آپ سوچئے کہ اس لونڈی سے یہ کہنے والا کون تھا؛ لیکن وہاں تو نظام ایسا قائم کر دیا گیا تھا جو حریت اور آزادی کی فضا سے معمور تھا۔ بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپؐ مجھے اس کا حکم دے رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسے معاملات میں مَیں حکم تو نہیں دے سکتا۔ یہ محض ایک مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ معاف فرمایئے۔ مَیں اس مشورہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں ـــــ اور حضورؐ ایک تبسمِ عاجز نواز کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

(۰)

جہاں تک خود اپنی ذات کا تعلق ہے حضورؐ نے مرض الموت کے دوران اعلان فرمایا:۔

لوگو! اگر مَیں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو میری پیٹھ حاضر ہے۔ وہ مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔ اگر میری زبان سے کسی شخص کے متعلق کوئی ناروا بات نکل گئی ہو تو وہ اسی طریق سے مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔ اگر میرے ذمے کسی کا کوئی قرض ہو تو وہ مجھ سے وصول کر لے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے میرے دل میں کسی قسم کا بغض یا کدورت پیدا نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں صرف ایک شخص نے کھڑے ہو کر تین درہم کا مطالبہ کیا جو آپؐ نے ادا فرما دیئے۔

(۰)

حضورؐ کی سیرتِ طیبہ تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے لیکن قلّتِ وقت کے احساس سے مجھے آگے بڑھ جانا چاہیئے اور اس فردوسِ بداماں داستان کے اگلے باب کی ابتدا حضرت صدیقِ اکبرؓ کے اس خطبہ سے کرنی چاہیئے جسے آپ نے منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد ارشاد فرمایا۔

خطباتِ خلافت

آپ نے کہا:۔

لے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں صحیح کام کروں تو اس میں میری مدد کرو۔ اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمہ ہے ۔۔ الخ

حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت کا آغاز اس طرح فرمایا:۔

لوگو! مَیں تم میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو مَیں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین کہو۔

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا:۔

بار الہا! میں سخت ہوں۔ مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔
یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا تو آپ نے بدرگاہِ رب العزت عرض کیا:۔
یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں انکے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔
آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا تو آپ نے تیسری دعا مانگی کہ:۔
الٰہا العالمین! میں بخیل ہوں۔ مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔
مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا:۔
ایہا الناس: اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ میرے سامنے تمہارا جو معاملہ آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہوگا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہوگی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا۔ اگر غلط روش اختیار کریں گے تو انہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔
اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا:۔
قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی کے مطابق عمل کرو تاکہ تم عاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے آپ کا محاسبہ کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔
اس کے بعد آپ نے اپنے لئے وہ دعا مانگی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اس میں آپ نے کہا کہ:۔
بار الہا! مجھے تفکر و تدبرِ قرآن عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔ تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔
ایک دوسرے خطبے میں جو اس سے زیادہ مفصل تھا آپ نے کہا:۔
اے لوگو! اب جبکہ تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تاکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن اس تمام سختی کے باوجود میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جنہیں میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں تاکہ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کر لو۔

(۱) تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

(۲) تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے وظائف میں اضافہ کروں۔ (تاکہ تم خوشحالی کی زندگی بسر کر سکو) اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں (تاکہ تم بیرونی خطرات سے محفوظ ہو جاؤ)۔

(۳) تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہیں خواہ مخواہ خطرات میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلا ضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکوں۔ اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہداشت کروں۔

ان کے مقابلے میں میرا تم پر صرف ایک حق ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اللہ تمہیں عطا کرے اس میں سے اپنے لئے صرف اتنا لے لوں جو میری اور میرے بال بچوں کی ضروریات پورا کر سکے۔

تمہاری جو ذمہ داریاں اللہ نے میرے سپرد کی ہیں۔ ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے حفاظت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب کا منتظر ہوں جب مجھے یہ بتانا ہو گا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

قادسیہ کی عظیم فتح کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:۔

واللہ! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنالوں۔ میں تو خود خدا کا غلام ہوں۔ اس نے میرے سپرد ایک امانت کر دی ہے۔ اگر میں اسے اس طرح استعمال کروں کہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں اور تمہیں گھر بیٹھے سیراب کر دوں تو میں سعادت مند ہوں۔ اور اگر میں اس امانت کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں تو میں بہت بدبخت ہوں گا کہ چند دن عارضی طور پر خوش ہو لوں اور پھر ابدی غم و الم میرے حصے میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس خیانت کے جرم سے مجھے کبھی معافی نہیں مل سکے گی اور نہ میں واپس بھیجا جاؤں گا کہ تمہیں آکر راضی کر لوں۔

خلیفہ یا بادشاہ

یہ تھے نظام خداوندی قائم کرنے والوں کے عزائم و مقاصد اور یہ تھا انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس۔ اور یہی احساس تھا جس کی بنا پر آپ نے ایک دن کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ، کیونکہ اگر میں بادشاہ ہوں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس پر مجمع میں سے ایک شخص برجستہ بولا کہ "خلافت اور شہنشاہیت میں بڑا فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے نہ ناجائز کچھ خرچ کرتا ہے۔ اس کے برعکس بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔ للہ الحمد کہ آپ خلیفہ ہیں بادشاہ نہیں ہیں"۔ اس پر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ بارگاہ احکم الحاکمین سجدہ ریز ہو گئے۔

ان حضرات کے اس قسم کے عہد و پیمان کے بعد اب میں چند ایک ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے عدل کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجائے گا۔ عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ قانون کے اطلاق میں کسی شخص کی ذاتی حیثیت کا کوئی لحاظ

نہ کیا جائے۔ اس زمانے میں عرب کی شمالی سرحدوں پر قدیم عربی قبائل آباد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ان قبائل کے سردار قیصر کی طرف سے اپنے اپنے علاقے کے حاکم تھے۔ وہ وہاں کے بادشاہ متصور ہوتے تھے۔ ان میں سے

جبلہ بن ایہم کا واقعہ

ایک قبیلہ کا سردار جبلہ بن ایہم اپنے قبیلہ کے پانچ سو افراد کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور مدینہ آ گیا۔ وہاں اُسے بڑی عزت اور تکریم کے ساتھ رکھا گیا۔ حج کے موقع پر وہ حضرت عمرؓ کی معیت میں مکہ آیا۔ طواف کے دوران اس کی چادر کا پلو ایک بدو کے پاؤں تلے آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس بدو کی ناک پر مکہ دے مارا۔ بدو نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور جبلہ نے اس کا اقرار کیا۔ اس پر آپ نے اس سے کہا کہ تم اس بدو کو منا کر صلح کر لو ورنہ تمہیں اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں بادشاہ ہوں اور وہ معمولی بدو ہے۔ میں اس سے کیسے معافی مانگ سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "بادشاہ اور بدو میں فرق تمہارے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے۔ اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ یہاں سب برابر ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنینؓ! میں تو سمجھا تھا کہ اسلام لانے کے بعد مجھے جاہلیت کے مقابلہ میں زیادہ عزت دی جائے گی لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام میں عزت کا معیار تقویٰ ہے اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ تم یا تو اس بدو کو راضی کرو ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دی جائے۔ اسے مہلت دے دی گئی۔

اس واقعہ کا خاصہ چرچا ہو گیا۔ بعض لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس معاملہ میں اس قدر سختی نہ برتیں۔ یہ شخص بڑا صاحبِ اثر ہے۔ آپ نے انہیں جواب دیا کہ اگر کسی شخص کی وجاہت کے اثر سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے، تو پھر خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی ملوکیت میں فرق کیا ہوا۔ چنانچہ آپ ذرا نہ جھکے اور جبلہ اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا اور پھر سے عیسائی ہو گیا۔

یہ تو دوسرے صاحبِ اثر و وجاہت کا معاملہ تھا۔ خود سربراہِ مملکت کی بات سن لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے ایک

اپنے خلاف فیصلہ

شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے تو گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ "اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کر لو"۔ اس نے کہا کہ "میں شریح کو ثالث ٹھہراتا ہوں"۔ انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ "امیر المؤمنینؓ! یا تو گھوڑا خرید لیجئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اسے واپس کیجئے"۔ اس فیصلہ پر آپ بہت خوش ہوئے اور شریح سے کہا کہ "آپ منصبِ قضا کے لئے نہایت موزوں ہیں"۔ ——— یہی ہیں کوفہ کے مشہور قاضی شریح جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمال حسن و خوبی سرانجام دیا تھا۔

عدالت میں

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ آپ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے ان سے کہا کہ "زید تم سے انصاف کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتداء ہی میں فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے"۔ یہ کہہ کر آپ مدعی کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ مدعی نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے مدعی سے کہا کہ امیر المؤمنین سے قسم لینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ بڑے ناراض ہوئے اور کہا کہ زیدؓ! تم منصبِ قضا

کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

لیکن اسی قسم کا ایک سہو ایک دفعہ خود حضرت عمرؓ سے بھی ہو گیا تھا۔ ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف آپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ قدرتاً ممتاز جگہ پر بیٹھ گئے تو آپ نے کہا: "ابوالحسنؓ! اٹھو اور اپنے مدعی کے مقابل جا کر بیٹھ جاؤ"۔ حضرت علیؓ وہاں جا کر بیٹھ گئے لیکن آپ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ "فریقِ مقابل کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا تھا؟" حضرت علیؓ بھی تو بالآخر دست پروردگانِ رسالت میں سے تھے۔ سنیئے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "عمرؓ! مجھے یہ قطعاً ناگوار نہیں گذرا۔ ناگوار یہ گذرا کہ تم نے مجھے تو میری کنیت (ابوالحسن) سے پکارا۔ اور فریقِ مقابل کو اس کے نام سے۔ اس سے تم نے جو عدمِ مساوات کا ثبوت دیا، مجھے وہ ناگوار گذرا تھا۔ (واضح رہے کہ عربوں کے ہاں کسی کو نام کے بجائے کنیت سے پکارنا اس کی تعظیم پر دلالت کرتا تھا) اور ان حضرات کو بارگاہِ عدل میں اتنا سا امتیاز بھی گوارا نہیں تھا۔

اور آگے بڑھیئے۔ آپ کے صاحبزادہ عبدالرحمان مصر میں تھے۔ ان سے کوئی لغزش سرزد ہو گئی تو وہ وہاں کے

اپنا بیٹا

گورنر حضرت عمروؓ بن عاص کے پاس پہنچے اور کہا کہ مجھے قانون کے مطابق اس کی سزا دیجئے۔ انہوں نے کوڑوں سے اس کی سزا تو دی لیکن کسی پبلک مقام کے بجائے اپنے گھر کے اندر سزا دی۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت عمروؓ بن عاص کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا:-

> ابن العاصؓ! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمان کو اپنے گھر کے اندر سزا دی۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے۔ عبدالرحمان تمہاری رعایا کا ایک فرد تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جو دوسرے مجرموں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے کہا کہ وہ امیرالمؤمنین کا بیٹا ہے اس لئے اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا چاہیئے حالانکہ تمہیں میرے نزدیک کسی شخص سے حق لینے میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے عبدالرحمان کو ایک ادنیٰ چغہ پہناؤ اور پالان پر سوار کر کے مدینہ روانہ کر دو تاکہ وہ اپنے جرم کی قانون کے مطابق سزا پائے۔
>
> اور امیرالمؤمنین کے بیٹے کو قانون کے مطابق سزا دی گئی۔

اب آگے چلیئے۔ اسی گورنر کے بیٹے نے ایک قبطی کو (جو وہاں ذمیوں ـــــ آج کل کی اصطلاح میں غیر مسلم اقلیتوں

گورنر کا بیٹا

کی حیثیت سے رہتے تھے) کسی بات پر کوڑوں سے پیٹا۔ وہ اسے کوڑوں سے پیٹتا جاتا تھا اور جوانی کے جوش میں کہتا جاتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ قبطی نے آ کر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں کو بلا بھیجا۔ اعترافِ جرم پر آپ نے اس قبطی سے کہا کہ "جس طرح اس نے تمہیں کوڑوں سے پیٹا تھا۔ اسی طرح تم اس کے کوڑے لگاؤ"۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "مار بڑوں کی اولاد کو اور مار"۔ وہ اسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمروؓ بن عاص) کے بھی مارو۔ کہ اگر اس نے

اپنے بیٹے کی صحیح تربیت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا اور غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمرؓ بن عاص کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریم آدمیت اور شرف انسانیت کا بنیادی منشور ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

"ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا" یہ ہے قرآن کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے ہر انسان کو اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر قرآنی نظام کی فلک بوس عمارت استوار ہوتی ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت کی ایک مثال تو آپ نے سن لی۔ اس کے بعد ایک مثال اور بھی سن لیجئے کہ جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں مل سکے گی۔

اقلیتوں کے حقوق

ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمرؓ بن سعد کے منہ سے ایک ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ـــــ اَخْزَاكَ اللّٰهُ "خدا تمہیں رسوا کرے" ـــــ یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے لیکن اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہہ کر استعفےٰ پیش کر دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ جو شخص کسی انسان کی تذلیل کرتا ہے وہ کسی ذمہ دار منصب کے اہل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

غور فرمایا آپ نے کہ نظام خداوندی میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اگلے باب کے لئے ورق الٹیں۔ عدل کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی بصیرت کی ایک مثال بھی سن لیجئے۔ عدالت میں صحیح فیصلہ کرنے کے لئے قابل اعتماد گواہ کی ضرورت لابدی ہے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ اپنی بات کی تائید کیلئے کسی ایسے آدمی کو لائے جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ:۔

قابلِ اعتماد گواہ

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے ـــــ اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو ـــــ اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ "نہیں" تو آپ نے فرمایا:۔

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابل اعتماد ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کسی کے لفظ اور قابل اعتماد ہونے کے لئے کیا معیار بتایا گیا ہے؟

اور آخر میں چلتے چلتے ایک غیر محسوس سا لیکن بڑا حسین (مونالیزا) جیسا تبسم۔ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ:۔

ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے معاف فرمائیے۔ مجھے اپنا دوست نہ بنائیے۔ دور دور ہی رہنے دیجئے۔

———— (۱) ————

معاشی نظام

ہم نے شروع میں اسلامی نظام کی منفرد خصوصیت کو علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں پیش کیا تھا کہ:-

کس درین جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولےٰ حاکم و محکوم نیست

ہم نے اس نظام میں حاکم و محکوم کے تفاوت اور عبد و مولےٰ کی تفریق کو ختم ہوتے دیکھ لیا ہے۔ اب اس کے دوسرے گوشہ کی طرف آیئے جس میں کہا گیا ہے کہ اس نظام میں کوئی سائل اور محروم نہیں ہوگا۔ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے:-

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس　　　نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

اس گوشے کا تعلق معاشیات سے ہے۔ اگرچہ معاشیات کی تاریخ عالم میں ہر زمانے میں بڑی اہمیت رہی ہے لیکن ہمارے دور میں اس نے ایسی ہمہ گیر اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ اس دور کو کہا ہی عصرِ معاشیات یا (AGE OF ECONOMICS) جاتا ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ اقوام عالم کی انتہائی کوششوں کے باوجود اس مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل رہا۔ میں نے اپنی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں (جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے) بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآنِ مجید اس مسئلہ کا حل کیا پیش کرتا ہے۔ اس کتاب میں یہ حل نظریہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس وقت میں چند ایک عملی مثالوں سے اس حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں جب یہ نظام قائم ہوا تھا تو اس مشکل ترین مسئلہ کو کس طرح حل کیا گیا تھا۔

نظامِ سرمایہ داری بنیادی طور پر تین ستونوں پر قائم ہوتا ہے:-

۱- ہر شخص اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

۲- ذرائع پیداوار اور وسائلِ رزق انفرادی ملکیت میں رہتے ہیں۔

۳- جو شخص جتنی دولت کمالے وہ اس کا مالک قرار پاتا ہے۔

نظامِ خداوندی ان تینوں ستونوں کو گرا کر اپنی عمارت نئی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ جہاں تک افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ

قرآنی نظام

زندگی کا تعلق ہے وہ ان کا پورا کرنا نظامِ مملکت کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ "زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔" دوسری جگہ بالخصوص انسانوں کے متعلق کہا: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی"۔ ان، اور ان جیسی دیگر آیات میں افرادِ معاشرہ کے رزق کا ذمہ دار خدا کو قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانوں کے متعلق جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لی ہیں وہ انہیں براہِ راست پورا نہیں کرتا۔ ان کا پورا کرنا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے جو خدا کے نام پر قائم کیا

جاتا ہے۔ اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ یا اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے سونا نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

ہمارے ہاں توکل علی اللہ کے الفاظ اٹھتے بیٹھتے دہرائے جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے توکل کا مفہوم کیا بتایا تھا وہ سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ انسانوں کے بارے میں خدا نے رزق کی جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لی ہیں، وہ نظامِ اسلامی کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ اس نظام میں اس اصول کو کس طرح عمل میں لایا جاتا تھا، اس کی مثالیں آگے چل کر آپ کے سامنے آئیں گی۔ لیکن اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ جب تک ذرائع رزق اس نظام کی تحویل میں نہ ہوں وہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ذرائع رزق میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے۔ زمین کے متعلق خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ملکیت ہے اس لئے کسی فرد یا افراد کے گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اسے اپنی ذاتی ملکیت میں لے لے۔ حضورؐ نبی اکرمؐ نے اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں فرما دی:۔

ان الارض ارض اللّٰہ والعباد عباد اللّٰہ۔　　(ابوداؤد)

زمین اللہ کی ملکیت ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

زمین کا انتظام

عربوں کے ہاں زرعی نظامِ معیشت نہیں تھا اس لئے ان کے ہاں چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی تھے۔ اس پر بھی حضورؐ نے اس امر کی تحدید فرما دی کہ زمین کسی کو بٹائی پر نہیں دی جا سکتی۔ ابوداؤد ہی کی ایک روایت میں ہے کہ:۔

حضرت رافعؓ بن خدیج نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اُدھر سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ "یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟" رافعؓ نے کہا کہ "یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا" حضورؐ نے فرمایا کہ "تم دونوں سود کا کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔"

حضورؐ کا یہ ارشاد کہ "تم دونوں سود کا کاروبار کر رہے ہو" بڑا حقیقت کشا ہے۔ ایک غریب کاشتکار کسی دولت مند کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپیہ بطور قرض دے دو" تاکہ میں فلاں قطعہ زمین خرید لوں، میں تمہیں اصل زر کے ساتھ اتنی زائد رقم بھی دے دوں گا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ "نا بھائی! یہ زائد رقم تو سود ہوگی جو حرام ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ وہ زمین خود خرید لیتا ہوں۔ تم اس میں کاشت کرو اور پیداوار میں سے نصف مجھے دے دو اور نصف خود رکھ لو۔" ہمارے مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے ایسا کرنا بالکل حلال اور طیب ہے۔ لیکن سوچئے کہ یہ درحقیقت سود کا کاروبار کی انتہائی شکل ہے۔ حضورؐ نے اسی لئے اس کی ممانعت فرما دی تھی۔ نقدی سود کی صورت میں فرضیہ کو سو پچاس روپے سالانہ ملتے۔ بٹائی کی شکل میں اسے پانچ سات سو روپے سالانہ مل جائیں گے۔ اس سلسلہ میں اور روایات بھی کتبِ احادیث

ہیں موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام اور عراق کا علاقہ فتح ہوا تو زمین کی ملکیت کا مسئلہ اپنی اہمیت کے ساتھ سامنے آیا۔ اس لئے کہ ان ممالک کی وسیع اور عریض زمینیں سونا اگلتی تھیں۔ اس سے پہلے مفتوحہ زمینوں کو بھی مالِ غنیمت کی طرح سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس مسلک پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ مسئلہ مجلسِ مشاورت کی کئی نشستوں میں زیرِ بحث رہا اور بالآخر قرآن کریم کی روشنی میں فیصلہ یہ ہوا کہ ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھا جائے تاکہ ان کی پیداوار سے مملکت اپنی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

وظائف

ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا سادہ سا انتظام یہ تھا کہ افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کر دیئے جاتے تھے۔ وظائف کے تعین کے لئے حضورؐ نے جو اصول اختیار فرمایا تھا اس کے متعلق علامہ ابن القیمؒ، زاد المعاد میں لکھتے ہیں:۔

> حضورؐ سب کو برابر نہیں دیتے تھے، نہ ہی میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم فرماتے تھے۔ آپ ہر ایک کی ضرورت کے مطابق دیتے تھے۔ کنواروں کی شادی کرتے تھے اور مقروضوں کا قرض بھی ادا کرتے تھے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں مملکت کی آمدنی بڑھ گئی تو وظائف میں بھی اسی نسبت سے اضافہ کیا گیا لیکن تقسیم کا اصول وہی برقرار رکھا۔ اس پر بعض صحابہؓ نے کہا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ اس کی خاطر اس قدر تکلیفیں برداشت کیں۔ ہجرت کی۔ جہاد کئے۔ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک ہونا چاہیئے۔ صدیقِ اکبرؓ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ اربابِ بصیرت کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ آپ نے کہا:۔

> آپ لوگوں نے ان حضرات کی جس اوّلیت و افضلیت کا ذکر کیا ہے میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ انہیں اس کا اجر ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا۔ لیکن یہ معاشی معاملہ ہے جس میں ترجیحی سلوک کے بجائے اصولِ مساوات، تقاضائے عدل ہے۔ یعنی بلا تخصیص ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔

ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ وقت ہوتا تو میں عرض کرتا کہ کیا یہی وہ نظام نہیں جس کی تلاش میں آج دنیا مارے مارے پھر رہی ہے لیکن انہیں وہ کہیں نہیں مل رہا۔ وہ قرآنی بارگاہ کے سوا کہیں مل ہی نہیں سکتا۔

زمین کے بعد آیئے مال و دولت کی طرف۔ اس سلسلے میں قرآن کریم نے بنیادی اصول یہ دیا ہے کہ ہر شخص، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کام کرے۔ اور اپنی محنت کے حاصل میں سے اپنی ضرورت کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے بطیبِ خاطر دے دے۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ (۲/۲۱۹)۔ "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں"۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ سب کا سب"۔ اس طرح قرآن کریم نے فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY)

ط اس خطاب میں مختلف اقتباسات کے حوالوں کے لئے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" دیکھئے جس میں اسلامی نظام کا نقشہ بڑی تفصیل سے سامنے لایا گیا ہے۔

کا وجود ختم کر دیا جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔

"اپنی ضروریات" کا تعین کس طرح کیا جاتا تھا، اس کی عملی مثالیں ابھی آپ کے سامنے آئیں گی۔ سرِدست آپ اس دور کو دیکھئے جس میں یہ نظام اپنے ابتدائی مراحل میں سے گذر رہا تھا۔ اس زمانے میں حضورؐ نے جماعت کے لئے کیا طریقِ کار اختیار فرمایا تھا اس کا اندازہ اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ:۔

اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا۔ یا کسی اور حادثہ کی وجہ سے فاقوں کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور برابر حصے لگا کر آپس میں بانٹ لیتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

ذاتی ضروریات کا معیار

ذاتی ضروریات کے سلسلے میں سربراہِ مملکت خود اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق:۔

حضورؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے جو دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن عربوں جیسی مفلوک الحال قوم کے افراد کی ضروریات اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں پورا کرنے کے لئے سربراہِ مملکت کو اسی قسم کا نمونہ پیش کرنا تھا۔

جہاں تک فاضلہ دولت کا تعلق ہے، ایک روایت میں ہے کہ:۔

مرض الموت کے وقت حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں بیت المال میں بھیج دو تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی۔ اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا۔ محمدؐ کا اپنے رب کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اس سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ حضورؐ نے انہیں خود بیت المال میں بھیج دیا۔

جہاں تک حضورؐ کے ترکہ کا تعلق ہے، بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ:۔

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔

اپنی زندگی کا اس قسم کا نمونہ پیش کرنے کے بعد آپؐ نے مملکت کے متعلق ایسے اصول متعین فرمائے جن کی رُو سے افرادِ معاشرہ کے رزق کے سلسلہ میں مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا:۔

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔

خدا کی نگرانی اور حفاظت کے ذمہ کے ختم ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کی مملکت کو کوئی بھی تباہی اور بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ یہ تباہی کس طرح آتی ہے اسے حضورؐ نے ایک مثال سے واضح فرما دیا:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے کچھ نیچے کے حصے

ہیں۔ جو نچلے حصّے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے نہ روکا جائے تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

یوں تباہ ہو جاتی ہے وہ مملکت جس میں ایک طبقہ ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے۔

اسی سلسلہ میں حضورؐ نے دوسرے مقام پر فرمایا:۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات کی طرف سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کی اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔

ابوداؤد کی یہی روایت ترمذی میں، ان الفاظ میں آئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

اب آگے بڑھیے اور نظامِ خداوندی کے اس دور میں آ جائیے جس میں مملکت کا سربراہ خدا کا رسولؐ نہیں، اس کے تربیت یافتگان تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد یہ سوال زیرِ غور آیا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا تعین میں خود کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا تعین کس طرح کیا گیا؟ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم اُجرت کیا ہے۔ وہی اُجرت آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے کہا کہ اتنے کم روزینے میں آپ کا گذارہ کیسے ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس میں میرا گذارہ اسی طرح ہوگا جس طرح اس مزدور کا گذارا ہوتا ہے۔ اور اگر گذارا نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا تاکہ اس طرح میرا وظیفہ بھی بڑھ جائے۔ جوں جوں مزدوروں کی اُجرت بڑھتی جائے گی میرا معیارِ زندگی اسی نسبت سے بلند ہوتا جائے گا۔

خلیفہ کا وظیفہ

جب بیت المال سے راشن آنا شروع ہوا تو ایک دن کھانے کے بعد آپ نے بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں جو راشن ملتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز آتی نہیں تو آج یہ حلوا کیسے پک گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جو اس دن محسوس کیا کہ آپ میٹھی چیز پسند کرتے ہیں تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آٹا ہر روز آتا تھا اس میں سے مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اس کے بدلے میں بازار سے کھجور کا شیرہ منگوا لیا جائے۔ اس طرح یہ حلوا پک گیا۔ آپ نے حلوہ تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔ کھانے کے بعد سیدھے بیت المال کے مودی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا آتا ہے آئندہ اس میں ایک مٹھی کم کر دینا کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گذارا مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔ اور ضرورت سے زائد لینے کی خدا کی طرف

ضروریات کا تعیّن

سے اجازت نہیں۔

اس قسم کی سیرت و کردار کے حاملین کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم ہوتا ہے!۔

(۰)

اب آگے بڑھئے اور خلافتِ فاروقی کے دَور میں آجایئے۔ جب یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ کائنات کو جگمگا رہا تھا اس دَور میں اسلامی مملکت قریب بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی جس میں عرب کے علاوہ پورے کا پورا ایران، مصر اور بازنطینی مملکت کے اور بہت سے حصّے شامل تھے۔ لیکن سلطنت کی اس وسعت کے ساتھ ذمہ داریوں کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہو گیا تھا۔ اس ذمہ داری کے احساس کی کیفیت کیا تھی، اس کا اندازہ

دورِ فاروقی

حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے لگ سکتا ہے جس نے گویا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ:۔

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

آپ نے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کس قسم کے عملی اقدامات کئے، ان کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی۔ آغازِ داستان کے لئے آپ اس امیرالمؤمنین کی اپنی زندگی کو سامنے لایئے۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد حسبِ معمول سب سے پہلا سوال خلیفہ کے وظیفہ کا سامنے آیا اور جس طرح حضرت ابوبکر رضؓ صدیق نے اپنا وظیفہ آپ مقرر کیا تھا۔ فاروقِ اعظم رضؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔ آپ نے جو وظیفہ اپنے لئے تجویز کیا وہ یہ تھا:۔

کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک سردی کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال۔

اپنے وظیفہ کے سلسلے میں فرمایا کہ:۔

اللہ کا مال میرے لئے یتیم کے مال کی طرح ہے۔ اگر ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اور حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لیتا ہوں۔

آپ نے اپنے وظیفہ کے ضمن میں کہا تھا کہ دو جوڑے کپڑے اور عام معیار کے مطابق کھانا۔ جہاں تک کپڑوں کا تعلق تھا حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ "میں نے عمر بن خطابؓ کو دیکھا۔ آپ کے ازار میں اکیس پیوند چمڑے کے اور ایک پیوند کپڑے کا تھا۔" جہاں تک کھانے کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ حضرت سارہ رضؓ کا پیغامبر آپ کے پاس آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ اس کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آگیا۔ کھانے میں جَو کی روٹی۔ زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ "امیرالمؤمنین! آپ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟" آپ نے جواب میں کہا:۔

ابن فرقد! کیا سرزمینِ عرب میں اس وقت مجھ سے زیادہ صاحبِ مقدرت کوئی ہے؟

اس نے کہا کہ کوئی نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس مقدرت کے باوجود میں جو گیہوں کی بجائے جَو کی روٹی کھاتا ہوں تو اس کی وجہ عدمِ مقدرت نہیں کچھ اور ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی

ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایسا تو نہیں کہہ سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ :۔

عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جو کی روٹی میسّر آ رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

ایک دفعہ آپ علیل ہو گئے تو دوائی کے لئے تھوڑے سے شہد کی ضرورت ہوئی۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن آپ نے کہا کہ جو راشن میرے لئے مقرر ہے چونکہ اس میں شہد شامل نہیں اس لئے میں مجلسِ مشاورت کی منظوری کے بغیر شہد نہیں لے سکتا۔ چنانچہ شہد، مجلس کی منظوری کے بعد لیا گیا۔

واضح رہے کہ حضرت عمرؓ اپنے آپ کو زندگی کی آسائشوں سے اس لئے محروم نہیں رکھتے تھے کہ آپ اہلِ تصوف کی طرح فقیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ ایسا کرنے والوں کو تو آپ بڑی سختی سے ڈانٹتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک زاہد مرتاض کو دیکھا جس نے دنیا کی ہر نعمت کو اپنے لئے حرام قرار دے رکھا تھا۔ آپ نے اسے ایک دُرّہ مارا اور فرمایا کہ :۔

خدا تجھے غارت کرے۔ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے۔

اپنی اس عسرت کی زندگی کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ :۔

اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گذرے جو عوام پر گذرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے اور جب مجھے ان کا احساس ہی نہیں ہوگا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا۔

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ :۔

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہونگے کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔

ذمہ داری کے اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ آپ دن بھر امورِ مملکت کو سرانجام دینے کے بعد راتوں کو بھیس بدل کر گشت کرتے اور بذاتِ خود معلوم کرتے کہ کس کو کیا شکایت ہے، اور حتی الامکان صبح ہونے سے پہلے اس کی شکایت رفع کر دیتے۔ چنانچہ کتبِ تاریخ میں اس قسم کے متعدد واقعات درج ہیں۔ ذمہ داریوں کے اس بارِ گراں سے صاحبِ اقتدار کی کیا حالت ہو جاتی ہے اُسے آپ نے چار لفظوں میں نہایت جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ ایک دفعہ ایک قاصد ایک اہم پیغام لے کر آیا لیکن اس نے آپ سے کچھ دیر کے بعد ملاقات کی۔ آپ نے اس تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ آتو میں پہلے ہی گیا تھا، لیکن دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے سمجھا کہ آپ قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ اس پر آپ نے کہا :۔ کہ "بھائی! جس شخص کے ذمہ مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف۔ اُسے تو راتوں کو بھی نیند نہیں آ سکتی"۔

اہلِ خانہ کو تنبیہہ

آپ نے اپنی اس احتیاط کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا تھا۔ اس میں اپنے گھر والوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ :۔

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو

فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں، جیسے پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ جو چاہے ان حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور دوگنی سزا کا یہ فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم میں سے کوئی کسی جرم کی مرتکب ہوگی تو اُسے دُگنی سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم اسلامی مملکت کے ہر سربراہ کے اہل خانہ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔

اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ آپ جزئیات تک کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے بیٹے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ جہاد سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰؓ اشعری سے ملے۔ انہوں نے کہا میں نے کچھ روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کے لئے بھیجنا ہے۔ وہ لیتے جاؤ۔ میں وہ روپیہ تمہیں بطور قرض دیتا ہوں۔ تم اس سے کچھ مال خرید لو۔ مدینہ جاکر مال بیچ دینا۔ اصل بیت المال میں جمع کرا دینا اور منافع خود رکھ لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہوگئی۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دے دیا تھا اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟ انہوں نے کہا کہ سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک اس لئے کیا کہ تم امیرالمؤمنین کے بیٹے تھے۔ جاؤ مال اور نفع دونوں بیت المال میں جمع کرو۔

ایک طرف تو یہ فیصلہ تھا۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے گیا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنی رقم واپس لے جا۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے گا تو پھر لے کر آنا۔

یہ تھی حکومت کے واجبات ادا کرنے کی صورت اور جب ضرورت مندوں کو ان کی ضرورت پوری کرنے کا سامان دیا جاتا تھا تو اس کی صورت یہ تھی کہ ایک ذی احتیاج اہلِ قافلہ کو سامان رسد دیا گیا اور انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:

بھائی! تم نے ایسا کیوں کہا۔ جو کچھ میں نے آپ لوگوں کو دیا ہے وہ میرا مال یا میرے باپ کا مال نہیں تھا۔ وہ اللہ کا مال تھا جسے اللہ کے بندوں کو دے دیا گیا۔ اس لئے میری شکر گذاری کیسی.....؟

امیرالمؤمنین کا پوتا

آپ کے زمانے میں ایک دفعہ بڑا سخت قحط پڑا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے کیا کیا تدابیر اختیار فرمائی تھیں وہ ایک الگ موضوع ہے۔ سردست میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کروں جس کا تعلق ہمارے زیرِ نظر موضوع سے ہے۔ ایک دن آپ نے دیکھا کہ آپ کا پوتا ککڑی (یا تربوز) کھا رہا ہے۔ آپ نے بیٹے کو بلایا اور طمانٹ کر کہا کہ "محمدؐ کی اُمت بھوکی مر رہی ہے اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے"۔ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! خفا نہ ہوجئے۔ عمرؓ کے پوتے کو پھل کسی خصوصی امتیاز کی بنا پر نہیں ملا۔ صبح کے ناشتے میں بچوں کو جو کھجوریں ملی تھیں اس نے ایک بدو لڑکے سے اس کے عوض یہ ککڑی (یا تربوز) لے لیا تھا۔

اسی قسم کا ایک اور چھوٹا سا واقعہ..... ایک دن بیت المال کے خزانچی جھاڑ دینے لگے تو کوڑے میں سے ایک درہم (یعنی اس زمانے کا سب سے چھوٹا سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ امیرالمؤمنین کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ میاں! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن اُمتِ محمدیہ جب مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

رزق کے معاملے میں اسلامی مملکت کی ذمہ داری کیا ہے اس کے متعلق بہت سی مثالیں آپ کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں۔ یہ نہیں تھا کہ اس ذمہ داری کا علم سربراہِ مملکت یا ارکانِ حکومت تک محدود تھا۔ رعایا میں سے ہر ایک کو اس کا علم تھا۔ ان کے اس علم کی کیا کیفیت تھی، اس کے متعلق دو ایک مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔ ایک رات گشت کے دوران آپ نے دیکھا کہ ایک خیمے میں ایک عورت نے ہنڈیا چولھے پر چڑھا رکھی ہے لیکن بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ بچوں کو تین وقت سے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے انہیں بہلانے کی خاطر خالی ہنڈیا چولھے پر چڑھا رکھی ہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ کیا تم نے امیرالمؤمنین کو اطلاع دی ہے کہ تمہارے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں۔ اس نے کہا کہ:

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر رہے، اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل؟

اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب خود حضرت عمرؓ اُسے یاد کیا کرتے تھے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو ویرانے میں ایک خیمہ دیکھا۔ قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک

شام کی بڑھیا

بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ "تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے؟" اس نے کہا کہ سُنا ہے کہ "وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے متعلق نہ مجھے کچھ علم ہے نہ معلوم کرنے کی ضرورت"۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ "جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں؟" آپ نے کہا کہ "کیا تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی؟" اس نے کہا کہ "یہ میرا کام نہیں تھا۔ عمرؓ کا کام تھا"۔ آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دُور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ:

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اُسے خدائے علیم و خبیر کے نام سے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور فرماتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے مجھے تمام کی اس بڑھیا نے سمجھایا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔ اس بازپرس کے احساس کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک بستی والوں نے ایک پیاسے مسافر کو پانی نہ دیا تو آپ نے اس کا خوں بہا خود ادا کیا اور پھر اسے اس بستی والوں سے وصول کیا۔ اسی فاروقی فیصلے کی رو سے یہ قانون بن گیا کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک یا پیاس سے مر جائے تو پوری کی پوری بستی پر اس کا خوں بہا لازم آجاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں کا وہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جو اسلامی تعزیرات کے فلسفہ پر تابناں روشنی ڈالتا ہے۔

حاطب کے غلاموں کا واقعہ

ان غلاموں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے ــــ یہ سن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس سے اسلامی مملکت کیلئے تعزیرات کے سلسلے میں ایک عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے جس میں کوئی شخص ارتکابِ جرم پر مجبور نہ ہو جائے۔ اگر مملکت ایسا ماحول اور ایسے حالات پیدا نہیں کرتی تو مجبوری کے تحت جرم کرنے والوں کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ معاشرہ میں اس بگاڑ کی ذمہ دار مملکت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔

اس کے برعکس جب حاکم امین ہو تو رعایا کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے مالِ غنیمت مدینہ بھیجا تو زر و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ مال و متاع آپ کے لئے وجہِ تعجب اور باعثِ مسرت ہوگا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وجہِ تعجب اور باعثِ مسرت ایک اور امر ہے وہ یہ کہ ہم نے جب یہ شہر فتح کئے تو یہ تمام زر و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور وہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سارے کا سارا مال مرکز میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو پھیر گئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے انہوں نے فرمایا کہ:۔

ابنِ خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔ چونکہ تم پاکدامن ہو اس لئے تمہاری رعایا بھی پاکدامن ہے۔ اگر تمہاری نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔

سربراہِ مملکت کی دیانت اور امانت کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے لگایئے۔ ایک رات آپ گشت کرتے کرتے تھک گئے۔ ایک مکان کے باہر اس کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ بیٹی اٹھو اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر چولھے پر رکھ دو۔

دودھ میں پانی ڈال دو

اس نے کہا ــــ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا ــــ اٹھ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کونسا امیر المؤمنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا — اماں! امیرالمومنین نہیں دیکھ رہا تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیرالمومنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا کر معلوم کرو کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اُسے بہو بنا کر گھر لے آؤ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں — معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔

ضمناً، اسی لڑکی کی اولاد سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے تھے جنہوں نے اپنے حسنِ کردار سے خلفائے راشدینؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اسی نسبت سے حضرت عمرؓ ان کے نانا کہلاتے ہیں۔

بہرحال یہ تھی وہ فضا، جو نظامِ خداوندی کے حاملین نے اپنی پاکیزگیٔ سیرت اور کیرکٹر کی بلندی سے اس طرح عام کر دی تھی کہ اس میں سانس لینے والے بھی دیانت اور امانت کے پیکر بن گئے تھے۔ آج وقت تو بہت تھوڑا تھا لیکن —— لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم —— بایں ہمہ اس حقیقت کی لذت اور شیرینی میں کسر رہ جائے گی اگر میں، اس کا اختتام حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اس ارشاد پر نہ کروں جس کی مثال کم از کم میری نظروں سے تو نہیں گذری۔ آپ نے ایک خطبہ کے دوران فرمایا۔

لوگو! یاد رکھو، میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں، لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔ لہٰذا تم اپنی شکایتیں مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص براہِ راست مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنی شکایت ان لوگوں تک پہنچا دے جو اسے مجھ تک پہنچا سکتے ہیں۔ میں ہر پکارنے والے کا حق، بغیر کسی پریشانی کے اس تک پہنچا دوں گا۔

آپ ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ:-

اللہ نے مجھے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

اور سوچئے کہ اس قدر عمیق حقیقت کو کس قدر لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان خدا سے اس وقت دعا مانگتا ہے جب اس کی کوئی ضرورت رُک جائے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ میں سے کسی کی کوئی جائز ضرورت رُکی نہ رہے۔ اس طرح وہ اس کی دعا کو خدا تک پہنچنے سے پہلے ہی روک دے۔

اس کے اندر ایک اور نکتہ بھی پوشیدہ ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے سربراہ کے خلاف خدا سے شکایت ہوگی کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دونگا کہ تم میں سے کسی کو میرے خلاف خدا سے شکایت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ ذمہ داریوں کے اس قدر شدید احساس کی بنیاد کیا تھی؟ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت آپ کے رفقاء آپ کی امانت، دیانت، عدل، انصاف کی تعریفیں کرتے تھے۔ آپؓ نے یہ سب کچھ سنا، زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ "اے کاش! میں عمرؓ ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا"۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ:-

اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر زیادتی کی ہوگی اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں خدا[1] عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

اسلامی نظام (یا آجکل کی مروجہ اصطلاح "نظامِ مصطفےٰ[2]" کی عمارت اس ایمان پر استوار ہوتی ہے کہ:-

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب　　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

[1] حاشیہ صلا کے نیچے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ایمان اوپر سے نافذ کردہ قوانین سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ پیدا ہوتا ہے تیرہ برس کی پیغمبرانہ مکی زندگی کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں قلب و نگاہ کی تبدیلی سے۔ اُس وقت، نظامِ خداوندی کا تقاضا افرادِ معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرتا ہے، جس طرح پیاسے کی پانی کی طلب۔ اس کا اندرونی تقاضا ہوتا ہے۔

اور اس قسم کی تعلیم و تربیت درحقیقت پرتو ہوتی ہے ان حضرات کے حسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کا جو اس نظام کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں جن لوگوں کا کردار اس قسم کی پاکیزگی اور بلندی کا آئینہ دار نہ ہو، انہیں اس نظام کا نام تک لینا بھی زیب نہیں دیتا۔ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ؎

نا شناسی از محمدؐ رنگ و بو   از درودِ خود میالا نامِ او

—— (۰) ——

بات تو مجھے یہیں ختم کر دینی چاہیئے تھی لیکن جی چاہتا ہے کہ مقطع کے بند کے طور پر جنابِ فاروقِ اعظمؓ کے چند ایسے اقوال بھی پیشِ خدمت کرتا جاؤں جو نظامِ خداوندی کے اربابِ حل و عقد کے لئے اصولی ہدایات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:-

۱۔ خلافت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو حساب دیتے وقت بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کیسے دیا تھا۔ اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔

۲۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔

۳۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو کہ خدا کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔

۴۔ کسی قوم سے مقابلہ کے وقت یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں تمہاری   خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

۵۔ حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

۶۔ ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہیئے۔

۷۔ ایک اور گورنر کو لکھا کہ ایسے رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف ہو اور بدقماش خوف زدہ۔

۸۔ عمالِ حکومت کے سلسلہ میں کہا کہ طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔

۹۔ وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں، اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔

۱۰۔ جو شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔

۱۱۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

۱۲۔ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔

۱۳۔ جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں وہ قصرِ سعد نہیں، محلِ فساد ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۳) نظام کا لفظ اگر دین کے مترادف معنوں میں استعمال کیا جائے تو پھر "نظامِ خداوندی" کہنا چاہیئے کیونکہ دین خدا کا عطا کردہ ہوتا ہے، رسول کا تخلیق کردہ نہیں۔ اسے "اسلامی نظام" بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "الاسلام" دینِ خداوندی ہے۔ "نظامِ مصطفیٰ" کی اصطلاح صرف اس صورت میں صحیح قرار پا سکتی ہے جب اس سے مراد ہو خدا کا وہ نظام جسے محمد رسول اللہ نے عملاً قائم کر کے دکھایا۔ میں اس کا یہی مفہوم لیا کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود مناسب یہی سمجھتا ہوں کہ نظامِ خداوندی کی اصطلاح ہی اختیار کی جائے تاکہ اسلام سے مفہوم دینِ خداوندی لیا جائے اور یہ (MOHAMMADANISM) نہ لیا جائے۔ اس اصطلاح کو مستشرقین کی سازش نے وضع کیا اور ہماری فریب خوردگی نے اختیار کر لیا تھا۔

۱۴۔ کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اُسے غصہ کی حالت میں نہ آزما لو۔

۱۵۔ ایک شخص نے کہا کہ مؤمن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ: فقرہ پورا کرو اور یوں کہو کہ مؤمن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔

۱۶۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچوں کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آجائے تو مرد بن جائے۔

۱۷۔ اندواجی زندگی میں مثالی معیار (IDEALISM) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۸۔ جوانوں سے کہا کہ جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہ ندامت نہ ہو۔

۱۹۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو مٹھی مٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔

۲۰۔ جس نے اپنی مدد کے لئے کسی خاندان یا برادری کا نام لے کر آواز دی سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی تفریقات ختم ہو جاتی ہیں۔

۲۱۔ اللہ تعالیٰ حالات اور زمانے کے تقاضوں سے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۲۔ عمرؓ کی رائے اور وحی خداوندی میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھو۔ عمرؓ کی رائے ایک انسان کی رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سند اور سنت نہ بناؤ۔

۲۳۔ کسی بات کے جواب میں واللہ اعلم بالصواب مت کہو۔ جو بات نہیں جانتے اس کے متعلق سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔

اور آخر میں اس عمرؓ کی شگفتہ مزاجی کی ایک مثال بھی سن لیجئے جس کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں ہر وقت دُرّہ ہوتا تھا اور ماتھے پر شکن۔ ایک دفعہ آپ نے ایک بدو کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا مانگی کہ یا اللہ! میری شادی کسی حور سے کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ اسے دیکھو کہ مہر کتنا کم باندھتا ہے اور بیوی کیسی بلند پایہ مانگتا ہے۔

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ مؤمن ——— عجم کے حسنِ طبیعت، عرب کے سوزِ دروں کا دلآویز امتزاج ہوتا ہے۔ اور اس امتزاج کا شفا بخش آئینہ اسلامی مملکت کا سربراہ۔

"نظام مصطفیٰ" انہی جیسوں کے ہاتھوں قائم ہوتا ہے۔ خدا انہیں مردانِ مومن اور اقبالؒ، بندۂ مولا صفات کہہ کر پکارتا اور ان کا تعارف ان وجد آفریں الفاظ سے کراتا ہے کہ:۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں، گرمیٔ محفل ہے وہ

انہی پر خدا اور اس کے فرشتے صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔ (۳۳/۴۳)

سیرۃ الرسولؐ

(ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

۱- پہلی وحی

جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوگئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ پر غارِ حرا میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا۔ "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا۔ "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا۔ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ رضؓ کے پاس پہنچ کر کہا۔ "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ"۔ چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوگئی تو آپ نے فرمایا۔ "اے خدیجہ رضؓ، یہ مجھے کیا ہوگیا ہے"۔ پھر سارا قصہ آپؐ نے ان کو سنایا اور کہا۔ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ انہوں نے کہا۔ "ہرگز نہیں، آپ خوش ہوجائیے۔ خدا کی قسم، آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں"۔

پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے ہیں۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے ان سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنئے۔ (ابونعیمؒ کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضؓ نے خود سارا قصہ وَرَقہ کو سنایا)۔ وَرَقہ نے حضورؐ سے کہا۔ بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟... رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ وَرَقہ نے کہا۔ "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا

فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ورقہ نے کہا "ہاں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپؐ کی بھرپور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۷۳ء - صفحہ ۱۴-۱۳)

———(٥)———

۲۔ خودکشی کا ارادہ

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد ایک مدت تک جبرائیل علیہ السلام کوئی وحی نہ لائے اور اس پر آپ کا رنج وغم اتنا بڑھتا چلا گیا جتنی یہ مدت طویل ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آپ بیخودی کے عالم میں کبھی ثبیر (مکہ کے ایک پہاڑ) اور کبھی غارِ حرا پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اس حالت میں جبکہ آپ کسی پہاڑ کے کنارے کا رُخ کر رہے تھے آپ نے آسمان سے ایک آواز سنی اور آپ ٹھہر گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرائیل ؑ آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمدؐ! آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں۔ (حضورؐ نے فرمایا کہ) میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کہا کہ مجھے اڑھاؤ۔ مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اڑھا دیا۔

(ترجمان القرآن - جنوری ۱۹۷۴ء)

———(٥)———

۳۔ معراج نبوی ؐ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے تقریباً ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبرائیل ؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ اور نیم بیداری کی حالت میں اُٹھا کر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اُسے علم اور بُردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔

(ترجمان القرآن - نومبر ۱۹۷۶ء)

———(٥)———

(اس کے بعد آسمانوں پر جانے کے سلسلہ میں وہ تمام باتیں لکھی گئی ہیں جنہیں آپ واعظوں کی زبانی سنتے رہتے ہیں۔ آخر میں بارگاہِ خداوندی میں ہم کلامی ہوئی اور پچاس نمازیں (روزانہ) فرض ہوئیں۔ اس کے بعد تحریر ہے)۔

۴۔ واپسی

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اُترے تو حضرت موسےؑ سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے روداد سن کر کہا۔ مَیں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں، میرا اندازہ ہے کہ آپ کی اُمت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جایئے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہ، نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسےؑ نے پھر وہی بات کہی۔ اُن کے کہنے پر آپ بار بار اُوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا، اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔ (کیونکہ ہر نیکی اللہ تعالےٰ کے ہاں دس نیکیوں کے برابر ہے)۔ (ترجمان القرآن - نومبر ۱۹۷۶ء - صہ ۲۰ - ۱۹)

—— (٥) ——

۵۔ حضورؐ پر جادو

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد آیا۔ اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا۔ جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو — تو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں، انہیں قبول کرو اور محمد (صلعم) پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں ایک یہودی لڑکا حضورؐ کے ہاں خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا۔ جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا۔ اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اُس نے جادو کرایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلعم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیر محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور صلعم پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جاتے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا — اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا۔ (تفہیم القرآن - جلد ششم - صہ ۵۵۴)

—— (٥) ——

۶۔ حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ شادی

(معاندینِ اسلام، حضورؐ کی ازدواجی زندگی کو سب سے زیادہ موردِ اعتراضات قرار دیتے ہیں۔ ان میں شدید ترین اعتراض یہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک چھ سالہ لڑکی (حضرت عائشہؓ) سے نکاح کیا اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی بھی عمل میں آگئی۔ پرویز صاحب نے تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایات صحیح نہیں۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ لیکن مودودی صاحب اس پر مُصر ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح چھ سال اور بوقتِ رخصتی نو سال کی تھی۔ اعتراضات کا وہ حسبِ ذیل جواب دیتے ہیں۔)

اس قسم کے اعتراضات صرف اسی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ رسول اللہ اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کو ایک عام مرد اور ایک عام عورت کا نکاح سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ حضورؐ اللہ کے رسولؐ تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لئے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی عظیم ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس انقلابی معاشرہ کی تعمیر میں حضورؐ کے ساتھ ملکر اتنا بڑا کام کرنا تھا جتنا دوسری تمام ازواجِ مطہرات سمیت اس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا..... ان کے بچپن میں ان کی ان صلاحیتوں کا علم اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ اسی بنا پر اپنے رسولؐ کی معیت کے لئے ان کا انتخاب اللہ تعالےٰ نے خود فرمایا..... جبرائیلؑ، رسول اللہؐ کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپؐ سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔ پس یہ انتخاب حضورؐ کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالےٰ کا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۷۶ء)

(جہاں تک نکاح کے لئے بلوغت کی شرط کا تعلق ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:۔)

صرف ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی قانون ہی نکاح کے لئے لڑکے اور لڑکی کی ایک خاص عمر مقرر کر سکتا ہے۔ (ایضاً)

(۰)

۷۔ کثرتِ ازواج

(معاندینِ اسلام کی طرف سے دوسرا اعتراض حضورؐ کی کثرتِ ازواج کے خلاف کیا جاتا ہے۔ پرویز صاحب نے سیرتِ نبویؐ پر اپنی کتاب ــــ معراجِ انسانیت ــــ میں اس اعتراض کا مدلل جواب دے کر بتایا ہے کہ اس کا محرک جنسی جذبہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس ــــ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ اپنی تمام (گیارہ) ازواج کا دورہ ایک رات میں کر لیا کرتے تھے اور جب حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضورؐ کو تیس مردوں کی طاقت دی گئی تھی۔ پرویز صاحب نے اس قسم کی روایات کو وضعی قرار دیا ہے لیکن مودودی صاحب ان کی تائید میں لکھتے ہیں:۔)

حضورؐ ایک کامل انسان تھے۔ تمام قوتیں آپ کے اندر غایت درجہ کے اعتدال پر تھیں ...... ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک طبعی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۳۸۔ ایڈیشن کا سال درج نہیں۔ غالباً یہ پہلا ایڈیشن ہے۔)

---(۰)---

۸۔ مقطوع الذکر والی روایت

مودودی صاحب سے کسی نے پوچھا:۔

سوال:۔ منکرینِ حدیث مسلم شریف کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی اُمّ ولد ماریہ قبطیہ سے زنا کرنے کا الزام ایک شخص پر لگایا گیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ ملزم کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ تلوار لے کر اس شخص کو قتل کرنے گئے تو وہ غسل کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ وہ مخنث تھا۔ آپ واپس چلے آئے اور آنحضرتؐ کو واقعہ سنا دیا۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) آنحضرتؐ نے محض الزام کی بنا پر، مقدمہ کی کارروائی کے بغیر، اور ملزم کی صفائی سنے بغیر اس کے قتل کرنے کا حکم کیسے دیا، حالانکہ یہ اسلام کی مجموعی اسپرٹ اور ان احادیث کے خلاف ہے جن میں اسلام کا عدالتی نظام بیان ہوا ہے۔

(۲) زنا کی سزا دُرّے ہے یا رجم (اگرچہ منکرینِ حدیث رجم کے قائل نہیں) پھر قتل کی سزا مذکورہ مقدمہ میں کیوں دی گئی۔ (سوال ختم ہوا)

مودودی صاحب نے جواب میں فرمایا:۔

اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔

جس واقعہ کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہ کے بارے میں مدینہ کے منافقین نے یہ افواہ اڑا دی تھی کہ اپنے چچا زاد بھائی سے ان کا ناجائز تعلق ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی پہنچی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ "اذھب فان وجدته عند ماریة فاضرب عنقه" جاؤ اگر تم اس کو ماریہ کے پاس پاؤ تو اس کی گردن مار دو۔" بعید نہیں کہ کہنے والے نے حضورؐ سے یہ کہا ہو کہ وہ وہاں اس وقت موجود ہے، آپؐ کسی کو بھیج کر دیکھ لیں، اور اس پر حضورؐ

نے فرمایا ہو کہ اگر وہ وہاں کسی غیر مناسب حالت میں پایا جائے تو جان سے مار دو۔ اس حکم کے مطابق حضرت علی رضؓ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک حوض میں نہا رہا ہے۔ آپ نے جاتے ہی اُسے ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر اُسے حوض میں سے کھینچ لیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص پانی سے بھرے حوض میں اترا ہو اس کے بارے میں باہر سے دیکھنے والے کو بیک نظر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ ننگا ہے یا ستر ڈھانکے ہوئے ہے۔ جب حضرت علی رضؓ نے اس کو باہر کھینچا تو یکایک آپ کی نظر اس کے ستر پر پڑی اور معلوم ہوا کہ وہ تو..... مقطوع الذکر ہے۔ آپ نے اسی وقت اسے چھوڑ دیا اور آکر حضورؐ کو حقیقتِ حال بتا دی۔

اب فرمائیے کہ اس واقعہ پر کیا اعتراض ہے اور کس پہلو سے ہے؟ یہ بات بھی عرض کر دوں کہ سند کے لحاظ سے یہ روایت ضعیف نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ دوم۔ ستمبر ۱۹۶۴ء ایڈیشن۔ ص ۵۵-۵۴)

(۰)

۹۔ انبیاء کرامؑ کی لغزشیں

(حضراتِ انبیاء کرامؑ چونکہ وحی خداوندی کا کامل اتباع کرتے تھے اس لئے ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی جسے لغزش کہا جا سکے۔ تدبیری امور میں بعض اوقات کسی خامی یا اجتہادی سقم کا رہ جانا اور بات ہے، لیکن اسے لغزش نہیں کہا جا سکتا۔ مودودی صاحب انبیاء کرامؑ سے لغزش کے صدور کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی حسبِ ذیل توجیہہ پیش کرتے ہیں:۔)

میرا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ اللہ تعالےٰ کی نگرانی میں کام کرتے ہیں (کرتے تھے!) اس لئے ان سے لغزش کا صدور اس بنا پر نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نعوذ باللہ کسی وقت ان سے غافل ہو گیا تھا بلکہ اس بنا پر ہوا کہ تاکہ دنیا پر یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ وہ بندے اور بشر ہی ہیں۔ خدائی صفات کے حامل نہیں ہیں۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ سستا ایڈیشن۔ ص ۳۷۵)

(۰)

۱۰۔ رسول اللہ کی معاذ اللہ اصول شکنی

[کوئی بیس سال اُدھر کا ذکر ہے، جماعتِ اسلامی کے بعض ممتاز حضرات نے مودودی صاحب پر الزام لگایا کہ انہوں نے جماعت سازی کے وقت جن بلند آہنگ اصولوں کو پیش کیا تھا، اب عملی سیاست میں پہنچ کر ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کر رہا ہوں تو کونسے جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں، (معاذ اللہ) خود رسول اللہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں]:۔

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل

ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآنِ مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ... الائمۃ من قریش۔ "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ سستا ایڈیشن۔ صفحہ ۳۲۹-۳۳۰)

(۰)

۱۱۔ جھوٹ بولنا

(مودودی صاحب کے خلاف یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا):۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۵-۵۴)

(۰)

طلوعِ اسلام

یہ ہیں اس سیرتِ نبویؐ کی چند ایک جھلکیاں جسے مودودی صاحب دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیا جائے تو جواب میں کہا جائے گا کہ مودودی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ یہ تمام واقعات کتبِ روایات میں موجود ہیں۔ مودودی صاحب کا قصور اتنا ہی ہے کہ انہوں نے انہیں ترتیب دے کر یکجا کر دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جن حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ کتبِ احادیث (کم از کم صحاح ستہ) میں جو روایات درج ہیں ہم ان کے صحیح ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی تنقید جائز نہیں سمجھتے۔ یہ حضرات اپنے اس عقیدہ کی رو سے ان روایات کو صحیح ماننے پر مجبور ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ نہیں وہ کتبِ احادیث میں درج شدہ کسی حدیث کو بھی محض اس لئے صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ائمہ حدیث نے

مودودی صاحب اور روایات

اسے صحیح قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔
>
> (رسائل و مسائل حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۹۰)

وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ:-

> یہ دعویٰ کرنا (بھی) صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس مجبوری کے تحت نہیں لکھا کہ کتبِ احادیث میں ایسا آیا ہے اور وہ ہر روایت کو صحیح ماننے پر مجبور ہیں۔ انہوں نے ان روایات کو اس بنا پر درج کیا ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی بنا پر انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ جس طرح قرآنِ مجید کو پوری صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے لانا ضروری ہے اسی طرح سیرتِ رسول اللہ کو بھی نہایت پاکیزہ اور منزہ شکل میں پیش کرنا اُمت کا فریضہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت، قرآنِ مجید کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔ آپؐ کی سیرت کے پاکیزہ اور منزہ ہونے کا معیار قرآنِ مجید ہے۔ ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں جو ایسے واقعات حضورؐ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضورؐ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہوتی ہے، ان کا مسترد کر دینا ضروری ہے۔ اسی قسم کی ہیں وہ روایات جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت درست نہیں۔ انہی روایات کا ہم انکار کرتے ہیں۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں اور حضورؐ کی سیرت و کردار کو بلند ترین مکارمِ اخلاق کا مظہر قرار دیتی ہیں، وہ ہمارے نزدیک سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ پرویز صاحب کی مرتب کردہ کتابِ سیرت (معراجِ انسانیت) ان کی اسی کوشش کا نتیجہ ہے اور بفضلِ ایزدی بڑی مقبول ہوئی ہے۔ یاد رکھیئے! قرآنِ مجید اور اس کے مطابق سیرتِ طیبہ وہ نورانی شمعیں ہیں جو انسانیت کے تاریک راستوں کو منور کرتی ہیں اور منور کرتی رہیں گی۔ اس کے خلاف جو سعی مذموم بھی کی جائے گی وہ ناکام و نامراد رہے گی۔

ضروری اعلان

طلوع اسلام کیلئے جملہ رقوم مثلاً منی آرڈر، چیک، بینک ڈرافٹ وغیرہ "ناظم ادارہ طلوع اسلام" کے نام بھیجی جائیں کسی کے نام سے کوئی رقم نہ بھیجی جائے۔ رقم کو (۲۵-A/ c) حبیب بینک (برانچ مین مارکیٹ گلبرگ II لاہور میں جمع کرنے کی ہدایت کے ساتھ پتہ انگریزی زبان میں:-

(MAHAGER IDARA TOLU-E-ISLAM, 25-B GULBERG-II, LAHORE, PAKISTAN)

لکھا جائے۔

"ناظم"